BAUL(N) - 320

بی.اے.اُردو

سمسٹر پنجم

BACHELOR OF ARTS (URDU)

FIFTH SEMESTER

MINOR

اُردو ادب کی تاریخ-۲

URDU ADAB KI TAREEKH - II

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

بی.اے.اُردو

BACHELOR OF ARTS (URDU)

سالِ سوم

THIRD YEAR

سمسٹر پنجم

FIFTH SEMESTER

بی.اے. یو.ایل.(این.) – ۳۲۰ – اُردو ادب کی تاریخ–۲

BAUL(N) - 320, Urdu Adab ki Tareekh - II

MINOR

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

سرپرستِ اعلیٰ:

پروفیسر نوین چندر لوہنی، وائس چانسلر، اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کمیٹی بورڈ آف اِسٹڈیز:

پروفیسر رینو پرکاش، ڈائریکٹر اسکول آف ہیومنٹیز ،اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی (UOU)، ہلدوانی۔

پروفیسر توقیر احمد خاں، ریٹائرڈ پروفیسر شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی۔

پروفیسر سید محمد ارشد رضوی، گورنمنٹ رضا پی .جی .کالج، رام پور، اُتر پردیش۔

ڈاکٹر شہپر شریف، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

محمد افضل حسین، اسسٹنٹ پروفیسر و کورس کوآرڈِنیٹر شعبۂ اُردو، اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

رجسٹرار:

شِری کھیم راج بھٹ ،اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کورس کوآرڈِنیٹر و ایڈیٹر:

محمد افضل حسین (اُستاد بریلوی)، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

© جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں
اس کتاب کا کوئی بھی حصّہ کسی بھی شکل میں یونی ورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔

یہ کتاب ''اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی'' کے بی.اے. اُردو سالِ سوم، سمسٹر پنجم، اُردو ادب کی تاریخ-۲ کے نصاب کا جزو ہے۔ مزید معلومات کے لئے یونی ورسٹی حکام یا صدرِ شعبۂ اُردو سے یونیورسٹی کے حسبِ ذیل پتے پر رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

DEPARTMENT OF URDU

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

UNIVERSITY ROAD, BEHIND TRANSPORT NAGAR (TEENPANI BYPASS)

HALDWANI - 263139 (NAINITAL) Phone : 05946 - 261122

BAUL(N) – 320 – URDU ADAB KI TAREEKH - II

Board of Studies

Prof. Renu Prakash
Director, School of Humanities,
Uttarkhand Open University, Haldwani

Prof. Syed Mohammad Arshad Rizvi
Department of Urdu,
Govt. Raza Post Graduate College, Rampur

Dr. Shahpar Shareef
Assistant Professor, Department of Urdu
Uttarkhand Open University, Haldwani

Prof. Tauqeer Ahmad Khan
Rtd. Professor, Department of Urdu
University of Delhi, New Delhi

Mohammad Afzal Husain
Head, Department of Urdu
Uttarkhand Open University, Haldwani

Vice Chancellor

Professor Naveen Chandra Lohani
Uttarkhand Open University,
Teen Pani By-pass Road, Haldwani - 263139

Registrar

Shri Khemraj Bhatt
Uttarkhand Open University,
Teen Pani By-pass Road, Haldwani - 263139

Programme Coordinator & Chief Editor

Mohammad Afzal Husain
Head, Department of Urdu
Uttarkhand Open University, Haldwani

Cover Page Design and Format Editing

Dr. Shahpar Shareef
Assistant Professor, Department of Urdu
Uttarkhand Open University, Haldwani

Unit Writers	Unit No.	Unit Writers	Unit No.
Dr. Shahpar Shareef	**UNIT – 01**	**Dr. Fatima Parveen**	**UNIT - 07**
Dr. Naseemuddin Farees	**UNIT - 02**	**Professor Aftab Ahmad Afaqi**	**UNIT - 08**
Dr. Naseemuddin Farees	**UNIT - 03**	**Dr. Sabir Ali**	**UNIT - 09**
Dr. Naseemuddin Farees	**UNIT - 04**	**Ghulam Jilani**	**UNIT – 10**
Mohammad Salim	**UNIT – 05**	**Mohammad Salim**	**UNIT - 11**
Shan-e Ali	**UNIT – 06**	**Dr. Mahmood Kazmi**	**UNIT - 12**

پیش لفظ

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی کا قیام اُتراکھنڈ قانون ساز اسمبلی کے ایک ایکٹ کے تحت ۳۱؍اکتوبر ۲۰۰۵ء کو عمل میں آیا جس کا مقصد فاصلاتی نظامِ تعلیم کے ذریعے آبادی کے بڑے حصے کے ایسے اَفراد کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل ہے جو کسی مصروفیت یا مجبوری کے سبب کالجوں یا یونی وَرسٹیوں تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ یونی ورسٹی کے تعلیمی پروگرام ''بیچلر آف آرٹ'' کے تحت ''بی.اے. اردو'' کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بی.اے. اُردو سالِ سوم، سمسٹر پنجم، اُردو ادب کی تاریخ-۲ کے نصاب کا جزو ہے۔ یہ کتاب ۱۲؍اکائیوں پر مشتمل ہے جو الگ الگ موضوعات پر مختلف اسباق کی شکل میں ہیں۔

عزیز طلبا و طالبات!

فاصلاتی نظامِ تعلیم کی کتابوں کو {خود تدریسی مواد {SLM}(Self Learning Material) کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو یہ مواد خود ہی پڑھنا ہے۔ روایتی درس گاہوں کے برخلاف اِسے پڑھانے کے لئے آپ کے سامنے استاد موجود نہیں ہوگا۔ اِس صورتِ حال کے تحت اسباق کو اِس طرح تیار کیا گیا ہے کہ آپ کو کلاس میں اپنی اور استاد کی موجودگی کا احساس ہو سکے۔ اِسی لئے ہر اکائی کا آغاز ''اغراض و مقاصد'' سے کیا گیا ہے تا کہ آپ کو اِس بات کا اندازہ ہو سکے کہ اکائی کو پڑھنے کا مقصد کیا ہے؟ اُس کے بعد ''تمہید'' دی گئی ہے جس میں سبق کو مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اکائی کے درمیان ''اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے'' کے تحت کچھ سوالات بھی دِیے گئے ہیں تا کہ آپ نے جو کچھ پڑھا ہے، اُسے کس حد تک ذہن نشین کیا ہے؟ اِس بات کا بھی اندازہ لگایا جا سکے۔ کتاب کے آخر میں اُن سوالات کے جوابات بھی دِیے گئے ہیں لیکن آپ کو چاہیے کہ پہلے خود اُن سوالات کو حل کریں پھر آخر میں دِیے گئے جوابات سے اپنے جوابات ملالیں تا کہ آپ کو اپنی صلاحیت کا اندازہ بھی ہو اور آپ کی ذہنی ورزش بھی ہو جائے۔ امتحان میں آپ سے جس طرح کے سوالات پوچھے جائیں گے اُس کے نمونے بھی دِیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہر اکائی کے آخر میں مشکل الفاظ کی ''فرہنگ'' اور ''حوالہ جاتی کتب'' کی فہرست بھی دی گئی ہے تا کہ آپ اُن کتابوں کے مطالعے سے اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر سکیں۔

ہم آپ کی کام یابی کے لئے دعائیں اور نیک خواہشات پیش کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

بی.اے.اُردو

(B.A.URDU)

سالِ سوم

THIRD YEAR

سمسٹر پنجم

FIFTH SEMESTER

بی.اے.یو.ایل.(این.) - ۳۲۰- اُردو ادب کی تاریخ-۲

BAUL(N) - 320, *Urdu Adab ki Tareek*h - II

اکائی نمبر	مضمون	مضمون نگار	
بلاک نمبر 01:			**5**
اِکائی 1	انجمن پنجاب کی تحریک	ڈاکٹر شہپر شریف	6
اِکائی 2	علی گڑھ تحریک	ڈاکٹر نسیم الدین فریس	23
اِکائی 3	ترقی پسند تحریک	ڈاکٹر نسیم الدین فریس	30
اِکائی 4	حلقۂ اربابِ ذوق	ڈاکٹر نسیم الدین فریس	40
اِکائی 5	جدید اُردو نثر	محمد سالم	47
اِکائی 6	جدید اُردو شاعری	شانِ علی	59
بلاک نمبر 02:			**84**
اِکائی 7	دبستانِ دہلی	ڈاکٹر فاطمہ پروین	85
اِکائی 8	دبستانِ لکھنؤ	پروفیسر آفتاب احمد آفاقی	93
اِکائی 9	فورٹ ولیم کالج	ڈاکٹر صابر علی	103
اِکائی 10	دہلی کالج	غلام جیلانی	110
اِکائی 11	فورٹ سینٹ جارج کالج	محمد سالم	125
اِکائی 12	بیسویں صدی کے چند اشاعتی ادارے	ڈاکٹر محمود کاظمی	136

بلاک نمبر 01

اکائی	01	انجمن پنجاب کی تحریک	ڈاکٹرشہپرشریف
اکائی	02	علی گڑھ تحریک	ڈاکٹرنسیم الدین فریس
اکائی	03	ترقی پسندتحریک	ڈاکٹرنسیم الدین فریس
اکائی	04	حلقۂ اربابِ ذوق	ڈاکٹرنسیم الدین فریس
اکائی	05	جدیداُردونثر	محمدسالم
اکائی	06	جدیداُردوشاعری	شانِ علی

اکائی 01 انجمن پنجاب کی تحریک

ساخت

01.01 : اغراض ومقاصد
01.02 : تمہید
01.03 : انجمن پنجاب کی تحریک
01.04 : انجمن پنجاب کے مقاصد
01.05 : انجمن پنجاب کے مشاعروں کی تاریخ
01.06 : خلاصہ
01.07 : فرہنگ
01.08 : نمونہ امتحانی سوالات
01.09 : حوالہ جاتی کتب
01.10 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

01.01 اغراض ومقاصد

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد ہندوستان میں ایک قسم کا تعطل پیدا ہو گیا تھا جس نے زندگی کے معمولات کو متاثر کیا۔اس تعطل کو دُور کرنے اور معاشرتی وثقافتی سرگرمیوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے حکومت کی جانب سے مختلف صوبوں اور شہروں میں علمی وادبی سوسائٹیاں قائم کی گئیں۔ان سوسائٹیوں کا مقصد نہ صرف ادب وعلم کو فروغ دینا تھا بلکہ لوگوں کو ایک نئے جوش اور حوصلے کے ساتھ معاشرتی سرگرمیوں میں مشغول کرنا تھا۔سب سے پہلے بمبئی، بنارس، لکھنؤ، شاہ جہاں پور، بریلی اور کلکتہ میں ایسی ادبی انجمنیں قائم کی گئیں جو وقت کے ساتھ ایک بڑی ادبی تحریک کی صورت اختیار کر گئیں۔اسی سلسلے میں لاہور میں بھی ایک ایسی انجمن قائم کی گئی جس کا مکمل نام ''انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب'' تھا جو بعد میں عام طور پر انجمن پنجاب کے نام سے معروف ہوئی۔یہ انجمن پنجاب میں علم وادب کی ترویج اور معاشرتی ترقی کی سمت میں ایک اہم قدم ثابت ہوئی۔اگر آپ اس اکائی کا تفصیل اور دھیان کے ساتھ مطالعہ کریں گے تو یہ نہ صرف آپ کو انجمن پنجاب کی تحریک کو گہرائی سے سمجھنے کا موقع ملے گا بلکہ آپ کی اس موضوع میں دل چسپی اور شوق میں بھی نمایاں طور پر اضافہ ہوگا۔اس اکائی کے مطالعے سے آپ انجمن پنجاب کی ادبی وعلمی سرگرمیوں، ان کے مقصد اور اثرات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے اور یہ آپ کو اس دَور کے ثقافتی اور سماجی منظرنامے کو نئے زاویے سے دیکھنے کی صلاحیت دے گا۔اس کے علاوہ آپ کو یہ موضوع مزید تحقیق اور مطالعہ کی جانب راغب کرے گا جس سے آپ کی فکری ترقی اور نظریاتی بصیرت میں اضافہ ہوگا۔

01.02 تمہید

انجمن پنجاب کی تحریک اُردو ادب کی ایک نہایت اہم تحریک ہے جس نے اُردو شاعری میں اہم کردار ادا کیا۔ اس تحریک نے نہ صرف اُردو نظم نگاری کو ایک باقاعدہ تحریک کی صورت میں متعارف کرایا بلکہ اس کے ذریعے نیچر یعنی قدرتی مناظر اور انسانی جذبات کی شاعری کے بہترین نمونے بھی پیش کیے گئے۔ اس تحریک میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ شاعری کی ہیئت یا ساخت پر کم توجہ دی گئی اور اس کے بجائے شاعری کے موضوعات پر زیادہ زور دیا گیا۔ اس کے ذریعے شاعری کو محض لذت یا انبساط کا ذریعہ بنانے کے بجائے ایک مقصدی اور مفاداتی عمل میں تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ شاعری نہ صرف ذاتی خوشی یا دل لگی کے لیے ہو بلکہ اس میں سماجی، اخلاقی یا فلسفیانہ پیغامات بھی شامل ہوں۔

انجمن پنجاب تحریک کے دَوران اُردو کے مختلف مشاعروں میں نہ صرف موضوعات کی تبدیلی آئی بلکہ شاعری کی ہیئت میں بھی کئی تجربات کیے گئے جنھوں نے اُردو شعری روایت کو مزید متمول اور متنوع بنایا۔ مختلف تجربات کے ذریعے شاعری کی نئی جہتوں کو متعارف کرایا گیا جس سے نہ صرف اُردو شاعری کا معیار بلند ہوا بلکہ اس میں جدیدیت کی ایک نئی لہر بھی آئی۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انجمن پنجاب کی تحریک نے اُردو ادب میں جدید دَور کی بنیاد رکھی اور اس کا آغاز کیا۔ اس زیرِ مطالعہ اکائی میں آپ کو اس تحریک کی ادبی خدمات سے تفصیلی تعارف حاصل ہوگا اور آپ سمجھ سکیں گے کہ کس طرح اس تحریک نے اُردو ادب کی سمت اور اس کے ترقیاتی عمل کو متاثر کیا۔

01.03 انجمن پنجاب کی تحریک

۱۸۳۵ء میں جب لارڈ میکالے نے فارسی اثرات کو ختم کرنے اور انگریزی زبان کو سرکاری سطح پر رائج کرنے کا فیصلہ کیا تو اس لسانی تبدیلی کا حکم پورے برصغیر میں بے چینی اور اضطراب کا سبب بن گیا۔ خاص طور پر مسلمانوں میں اس فیصلہ کا گہرا اثر ہوا کیوں کہ فارسی زبان مسلمانوں کی ثقافتی اور علمی شناخت کا ایک بڑا حصّہ تھی۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں مسلمانوں میں ایک عام بے چینی اور غیر یقینی کی صورتحال پیدا ہو گئی اور ان کے ذہنوں میں یہ سوالات اُٹھنے لگے کہ اب ان کی زبان اور ثقافت کا کیا ہوگا۔ اس پس منظر میں مسلمانوں کو کچھ مدت کے لیے اُردو کو سرکاری اور دفتری زبان قرار دینے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ ان کی دل شکنی کو کم کیا جا سکے اور ان کی ثقافتی شناخت کو کچھ حد تک تحفظ مل سکے۔ تاہم ۱۸۵۷ء کے بعد غیر مسلموں اور انگریزوں نے اُردو کے بجائے ہندی کی حمایت شروع کر دی اور اس کی مخالفت کی۔ خاص طور پر بنگال، سی پی، بہار اور یو پی میں ہندی کو سرکاری دفتری زبان کے طور پر رائج کرنے کے لیے ناگری رسم الخط کو عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں متعارف کرانے کی کوششیں کی گئیں۔ اس دَوران اُردو کی سرکاری حیثیت کم کرنے اور ہندی کی ترویج کے لیے سرگرمیاں بڑھا دی گئیں لیکن پنجاب میں اُردو زبان اتنی گہری جڑوں میں رچی بسی ہوئی تھی کہ یہاں سے اُردو کو ختم کرنا انگریزوں کے لیے ایک مشکل امر ثابت ہوا۔

پہلی جنگ آزادی میں انگریزوں کی کامیابی کے بعد سیاسی سطح پر انگریزوں کی حکومت پورے ہندوستان میں قائم ہو گئی اور اس فتح کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ایک ایسی حکومتی ساخت کی ضرورت محسوس کی گئی جو حاکم اور محکوم کے درمیان افہام و تفہیم کی راہیں ہموار کرے۔ انگریزوں کی حکومت کے تحت دونوں قوموں کے درمیان موجود ذہنی اور فکری خلیج کو کم کرنے اور ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے ایسے اداروں اور انجمنوں کا قیام ضروری سمجھا گیا جو اس مقصد کو حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہو سکیں۔

انجمن پنجاب کی تحریک کا قیام بھی اسی پس منظر میں ایک اہم قدم تھا اور اسے اسی سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس سے پہلے مختلف شہروں جیسے بنارس، لکھنؤ، شاہجہاں پور، بریلی اور کلکتہ میں بھی انجمنیں اور سوسائٹیاں قائم کی جا چکی تھیں جو مختلف علمی اور ثقافتی سرگرمیوں میں مصروف تھیں۔ ان ہی کوششوں کے نتیجے میں انجمن پنجاب کا قیام ۲۱ر جنوری ۱۸۶۵ء میں عمل میں آیا۔ آغاز میں اس انجمن کا نام انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب تجویز کیا گیا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ انجمن ''انجمن پنجاب'' کے نام سے زیادہ معروف ہوئی۔ انجمن پنجاب کے قیام میں ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر نے اہم اور نمایاں خدمات انجام دیں۔ لاہور کالج کے پرنسپل ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر کو اس انجمن کا صدر مقرر کیا گیا۔ ڈاکٹر لائٹنر نہ صرف علوم مشرقی کے تحفظ اور احیاء میں گہری دل چسپی رکھتے تھے بلکہ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ لارڈ میکالے کی حکمت عملی کے مطابق انگریزی زبان کے ذریعے تعلیم دینے کا طریقہ عملی مشکلات سے دوچار تھا۔ اس گہری بصیرت اور فہم کی بنا پر ڈاکٹر لائٹنر نے اس خطے کی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کی ضرورت کو سمجھا اور انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب کی بنیاد رکھی تاکہ علمی اور ادبی سرگرمیوں کو فروغ دیا جا سکے۔

انجمن پنجاب کی تحریک کے قیام کا مقصد صرف علمی و ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینا نہیں تھا بلکہ اس نے اس وقت کی سماجی اور ثقافتی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ اہم مقاصد طے کیے۔ ان مقاصد میں حاکم اور محکوم کے درمیان موجود فکری فاصلے کو کم کرنا اور دونوں طرف کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا تھا تاکہ ایک نئی فکری اور ثقافتی ہم آہنگی پیدا کی جا سکے۔

اُردو ادب کو انگریزی کے اثرات اور نئی علمی روشنی سے ہم آہنگ کرنے اور قدیم روایات کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں جن اہم تحریکات نے کردار ادا کیا ہے ان میں انجمن پنجاب کی تحریک کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ یہ تحریک ایک وسیع و متنوع نوعیت کی تحریک تھی جس نے نہ صرف ادب بلکہ سیاست، سماج، تہذیب، ثقافت اور علم و ادب کے دیگر مختلف شعبوں میں ہمہ جہتی ترقی کی راہیں ہموار کیں۔ اس تحریک کی خصوصیت اور اس کے مختلف پہلو ہی اسے ایک منفرد اور نمایاں تحریک بناتے ہیں۔

اگر ہم انجمن پنجاب کو فورٹ ولیم کالج یا دہلی کالج کی طرح صرف ایک کلرک ساز ادارہ قرار دیں تو یہ اس انجمن کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی کیوں کہ انجمن پنجاب کے قیام میں جن اہم شخصیات نے کردار ادا کیا، ان میں ڈاکٹر لائٹنر کا نام سرفہرست ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر لائٹنر برطانوی نژاد نہیں تھے اور انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی کا بیشتر حصّہ اسلامی ممالک میں گزارا تھا اس لیے وہ اسلامی تہذیب و ثقافت اور روایات سے گہری آشنائی رکھتے تھے۔ ڈاکٹر لائٹنر نہ صرف برطانوی حکومت کے نظامِ تعلیم سے ہمدرد نہیں تھے بلکہ وہ برطانوی حکومتی اقدامات کے تحت ہندوستانیوں کو ان کے تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی ورثے سے محروم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اہلِ ہند اپنی روایات اور ثقافت کو برقرار رکھتے ہوئے جدید علوم کی طرف پیش قدمی کریں۔ اس لیے انجمن پنجاب میں ڈاکٹر لائٹنر نے علوم السنہ شرقیہ کے احیاء کی بھرپور حمایت کی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ صرف برطانوی حکومت کا دائرہ کار یا اس کی پالیسیوں کی تقلید کرنا ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس وہ چاہتے تھے کہ انگریزی علوم کو ہندوستانی ثقافت کے تناظر میں پیش کیا جائے۔ برطانیہ اس وقت صرف سنسکرت کی سرپرستی کر رہا تھا لیکن انجمن پنجاب نے اس کے مقابلے میں ایک اور اہم کام کیا۔ اس نے لاہور کالج کا قیام عمل میں لا کر ثابت کر دیا کہ ہندوستانی ثقافت اور روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے برطانوی حکومتی نظام تعلیم سے آزاد ایک خودمختار تعلیمی ادارہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

اس کالج نے نہ صرف اُردو زبان کو تعلیمی لحاظ سے اہمیت دی بلکہ اس کے ذریعے جدید علوم کو اُردو میں پڑھانے کی راہ ہموار کی جو برصغیر کے مسلمانوں اور دیگر طبقوں کے لیے ایک نیا اور منفرد تعلیمی ماڈل تھا۔اس طرح انجمن پنجاب نے ایک نئے تعلیمی نظام کی بنیاد رکھی جو صرف برطانوی اثرات کے تابع نہیں تھا بلکہ ہندوستانی ثقافت کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتا تھا۔

انجمن پنجاب نے اُردو ادب میں جدید نظم نگاری کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ابتدائی طور پر اس انجمن کے تحت مشاعرے روایتی نوعیت کے تھے لیکن بعد میں انگریز حکام کی دل چسپی کے باعث یہ مشاعرے جدید شاعری کے فروغ میں اہم ثابت ہوئے۔ان مشاعروں میں محمد حسین آزاد کا کردار نہایت اہم تھا اور ان کا نام انجمن کے تحت ہونے والے مشاعروں میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔اس تحریک کی علمی اور ادبی کامیابیاں کرنل ہالرائیڈ کی تحریک، ڈاکٹر لائٹنر کی سرپرستی اور مولانا محمد حسین آزاد کی گہری دل چسپی کی نشان دہی کرتی ہیں۔انجمن کے جلسوں میں مولانا آزاد نے اُردو شاعری اور ادب کا نیا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔انہوں نے اُردو ادب کی خامیوں اور کوتاہیوں کی طرف اشارہ کیا اور انگریزی ادب سے فائدہ اٹھانے کی تجویز دی۔اسی دَوران انہوں نے خود بھی نظمیں لکھیں اور نئی شاعری کا ایک نمونہ فراہم کیا جس سے اُردو شاعری میں ایک نیا رنگ اور رخ آیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ انجمن پنجاب کا ابتدائی نام کیا تھا؟
﴿۲﴾ کس علاقے میں اُردو کے ختم ہونے کی مخالفت کی گئی؟
﴿۳﴾ انجمن پنجاب نے اُردو ادب پر کیا اثر ڈالا؟
﴿۴﴾ کس شخص نے جدید اُردو شاعری کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا؟
﴿۵﴾ انجمن پنجاب کب قائم ہوئی؟
﴿۶﴾ لارڈ میکالے نے انگلش کو سرکاری زبان بنانے کا فیصلہ کب کیا؟
﴿۷﴾ کہاں ہندی کو سرکاری زبان کے طور پر متعارف کرایا گیا؟
﴿۸﴾ انجمن پنجاب کے قیام کا مقصد کیا تھا؟
﴿۹﴾ انگلش کو سرکاری زبان بنانے کے فیصلے کا مسلمانوں پر کیا اثر ہوا؟
﴿۱۰﴾ انجمن پنجاب نے اُردو شاعری پر کیا اثر ڈالا؟
﴿۱۱﴾ ڈاکٹر لائٹنر نے برطانوی تعلیمی پالیسیوں کے بارے میں کیا کہا؟

01.04 انجمن پنجاب کے مقاصد

محمد حسین آزاد اور ڈاکٹر لائٹنر نے اپنے جدید اور اہم نظریات کو عملی طور پر پیش کرنے کے لیے انجمن پنجاب کو ایک اہم پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کیا اور اس کے ذریعے لوگوں میں ایک فعال ادبی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ان دونوں شخصیات نے اس انجمن کو ایک ایسا ذریعہ بنایا جس کے ذریعے نہ صرف ادبی بلکہ سماجی اصلاحات کے لیے بھی کام کیا جا سکے۔

انجمن پنجاب کے قیام کے وقت اس کے اغراض و مقاصد کا ایک واضح خاکہ مرتب کیا گیا تھا جو اس تحریک کی سمت اور مقصد کو طے کرتا تھا۔ ان مقاصد میں سب سے اہم مندرجہ ذیل نکات شامل تھے:

(۱) اول : قدیم مشرقی علوم کا احیاء۔

(۲) دوم : صنعت وتجارت کا فروغ۔

(۳) سوم : باشندگانِ ملک میں دیسی زبان کے ذریعے علوم مفیدہ کی اشاعت۔

(۴) چہارم : علمی وادبی، معاشرتی اور سیاسی مسائل پر بحث ونظر۔

(۵) پنجم : صوبے کے بارسوخ اہلِ علم طبقات اور افسران حکومت میں رابطہ۔

(۶) ششم : پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے خطوں کے ساتھ روابط اور تعلقات کی استواری۔

ان مقاصد کی تکمیل کے لیے انجمن پنجاب نے ایک جامع منصوبہ بنایا جس کے تحت مدارس، کتب خانے اور دارالمطالعہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ علم وادب کے فروغ کے لیے ایک مستقل ڈھانچہ فراہم کیا جا سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ انجمن نے اپنی آواز کو دوسرے صوبوں تک پہنچانے کے لیے مختلف رسائل کے اجرا کا پروگرام تیار کیا تاکہ اُردو زبان اور مشرقی علوم کا احیاء ہو سکے اور لوگوں میں علمی وادبی سرگرمیاں بڑھ سکیں۔ علاوہ ازیں، سماجی، تہذیبی، اخلاقی، انتظامی، علمی اور ادبی موضوعات پر تبادلۂ خیالات کے لیے جلسوں کا انعقاد کیا گیا تاکہ مختلف طبقوں کے لوگ آپس میں مل کر ان اہم مسائل پر گفتگو اور تجزیہ کر سکیں۔

انجمن پنجاب کا دائرہ بہت وسیع نظر آتا ہے کیوں کہ اس نے نہ صرف علم وادب کے شعبے میں کام کیا بلکہ سماجی اصلاحات اور انتظامی سطح پر بھی بہت سے اقدامات اٹھائے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ پہلی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان کی عوام انگریزوں سے خوفزدہ اور محتاط رہتے تھے اور ان کے ہر قدم کو شک اور بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کے پیشِ نظر انجمن پنجاب کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ اس بدگمانی اور خوف کو دوُر کرے اور عوام کو اس بات پر قائل کرے کہ انگریزوں کا نظام اب عوام کے فائدے کے لیے کام کر رہا ہے۔

انجمن پنجاب کے ابتدائی اجلاسوں میں بیشتر شرکاء سرکاری ملازم، روٴسا اور جاگیردار تھے لیکن جلد ہی اس کی رکنیت عوام کے لیے کھول دی گئی۔ اس کے نتیجے میں انجمن کے کاموں میں عوام کی بھرپور شرکت ہونے لگی اور وہ اقدامات جو غیر سرکاری تحریکات کے ذریعے ممکن نہیں تھے، اب سرکاری سرپرستی اور حکام کی دل چسپی کی بدولت کامیابی کی منزل تک پہنچنے لگے۔

انجمن پنجاب کا ایک اور اہم کام یہ تھا کہ اس نے مختلف موضوعات پر ہفتہ وار مباحثوں کا سلسلہ شروع کیا جو نہ صرف علمی وادبی لحاظ سے کامیاب ثابت ہوا بلکہ اس کی بازگشت سرکاری ایوانوں میں بھی سنائی دینے لگی۔ اس طرح انجمن نے نہ صرف عوامی سطح پر بلکہ حکومتی سطح پر بھی اثر ورسوخ حاصل کیا اور اپنی آواز بلند کی۔ انجمن پنجاب کے جلسوں میں اس بات کی آزادی تھی کہ پڑھنے والے مضامین پر کھلے دل سے بحث ونظر کی جا سکے۔ اس طرح کے دستور العمل سے شرکاء کو بحث میں حصّہ لینے، علمی نکتہ چینی کرنے اور صحت مند تنقید کو برداشت کرنے کی تربیت ملتی تھی۔ اس کے نتیجے میں انجمن پنجاب نے ہندوستان میں مجلسی تنقید کی پہلی اور مضبوط روایت کو متعارف کرایا۔ انجمن نے علمی امور میں

وسیع النظر، کشادہ دلی اور عالی ظرفی کے جذبات کو فروغ دیا جس کا مقصد تھا کہ لوگ آپس میں بات چیت کرتے ہوئے ایک دوسرے کے خیالات کا احترام کریں اور نیا علم پیدا کریں۔ بیسویں صدی میں جب حلقۂ اربابِ ذوق کی تحریک نے جنم لیا تو اس نے انجمن پنجاب کی اس مجلسی تنقید کی روایت کو اپنایا اور ہفتہ وار تنقیدی جلسوں کے ذریعے ادب کی نوعیت اور اس کے طرزِ فکر کو بدلنے کی کوشش کی۔

انجمن پنجاب کے جلسوں کی نوعیت عموماً انتظامی تھی اور ان میں صرف انجمن کے عہدیدار ہی شریک ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود جلسہ عام میں شرکت کرنے اور دانشوروں کے مضامین سننے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اسی لیے انجمن پنجاب کی تحریک میں جلسہ عام کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی کیوں کہ اس میں عوام کو بھی شریک ہونے کا موقع ملتا تھا اور اس کے ذریعے وسیع حلقے میں علمی و ادبی سرگرمیوں کو فروغ دیا جاتا تھا۔ انجمن پنجاب کے ابتدائی جلسوں میں مولوی محمد حسین آزاد، پنڈت من پھول، ڈاکٹر لائٹنر، بابو نوبین چندر رائے، بابو شاما چرن، مولوی عزیز الدین، بابو چندر ناتھ اور پروفیسر علمدار حسین جیسے نمایاں شخصیات نے مضامین پیش کیے تھے۔ ان میں سے بیشتر مضامین انجمن پنجاب کے رسالے میں شائع ہوئے۔ ان انجمن کے جلسوں میں سب سے زیادہ تحسین مولوی محمد حسین آزاد کے مضامین کو ملی جن کی فکری گہرائی اور زبان کی سلیقے کی وجہ سے وہ تمام شرکاء کی توجہ کا مرکز بنے۔ اس قدر تحسین کے بعد ڈاکٹر لائٹنر نے انجمن کے اخراجات پر محمد حسین آزاد کو مستقل طور پر لیکچرار مقرر کرنے کی تجویز پیش کی جسے منظور کرلیا گیا۔ اس کے بعد کلکتہ سے واپسی پر آزاد نے اس کردار کو مؤثر انداز میں نبھایا اور انجمن پنجاب کو نہ صرف ایک ادارہ بلکہ ایک فعال اور توانائی سے بھرپور تحریک بنا ڈالا۔ ان کی محنت اور لگن کے نتیجے میں انجمن پنجاب نے نہ صرف اُردو ادب کو فروغ دیا بلکہ پورے پنجاب اور اس سے آگے کے علاقوں میں ایک نیا ادبی ماحول تشکیل دیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱۲﴾ انجمن پنجاب کے قیام کے وقت کون سی شخصیات اہم تھیں؟

﴿۱۳﴾ انجمن پنجاب نے کس زبان کے فروغ پر زور دیا؟

﴿۱۴﴾ انجمن پنجاب نے کب اور کہاں سے علمی اور ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینا شروع کیا؟

﴿۱۵﴾ انجمن پنجاب کے قیام کا مقصد کیا تھا؟

﴿۱۶﴾ انجمن پنجاب کے اہم مقاصد میں کیا شامل تھا؟

﴿۱۷﴾ محمد حسین آزاد کو انجمن پنجاب میں کیا عہدہ ملا؟

﴿۱۸﴾ انجمن پنجاب کے جلسوں میں کس بات کی آزادی تھی؟

﴿۱۹﴾ انجمن پنجاب کے ابتدائی اجلاسوں میں کون لوگ شریک تھے؟

﴿۲۰﴾ انجمن پنجاب میں عوام کی شرکت کا کیا طریقہ تھا؟

﴿۲۱﴾ محمد حسین آزاد کا انجمن پنجاب میں کردار کیا تھا؟

﴿۲۲﴾ انجمن پنجاب کے ہفتہ وار مباحثوں کا کیا مقصد تھا؟

﴿۲۳﴾ انجمن پنجاب نے کس طریقے سے علم و ادب کو فروغ دینے کی کوشش کی؟

01.05 انجمن پنجاب کے مشاعروں کی تاریخ

۵/اگست ۱۸۶۷ء کو انجمن کے زیرِ اہتمام ہونے والے ایک اجلاس میں مولانا آزاد نے ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات'' کے موضوع پر ایک اہم لیکچر دیا۔ اس لیکچر میں انہوں نے نظم کی شاعری کی اہمیت اور ضرورت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ آزاد نے اس موقع پر اُردو شاعری کی ترقی اور ادبی معیار میں انقلاب لانے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے واضح کیا کہ شاعری کا مقصد صرف تفریح اور تفنن کا سامان فراہم کرنا نہیں بلکہ اسے ایک ایسا ذریعہ بنانا ضروری ہے جو معاشرتی اور تہذیبی اصلاحات میں معاون ہو اور اس کے ذریعے ایک نئے نصب العین کی تشکیل کی جائے۔ آزاد کا یہ لیکچر اُردو شاعری میں ایک نئی سمت کی نشان دہی کرتا تھا جس میں شاعری کو محض تفریحی مقصد کے بجائے ایک اہم فکری اور ادبی وسیلہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح انہوں نے شاعری کی نوعیت اور اس کے مقاصد میں ایک نیا تناظر پیش کیا جس کا اثر اُردو ادب پر دیرپا ثابت ہوا۔

عام طور پر یہ تصوّر کیا جاتا ہے کہ جدید مشاعروں کے بانی مولانا محمد حسین آزاد تھے اور انہوں نے ان مشاعروں کی بنیاد خود رکھی لیکن تاریخی حقائق اس خیال کی تائید نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مشاعروں کا آغاز دراصل حکومت کے ایما پر ہوا تھا۔ اس کے باوجود یہ بات درست ہے کہ محمد حسین آزاد ان مشاعروں کے سیکریٹری تھے اور ان کا اہم کردار تھا۔ ڈاکٹر لائٹنر جو مشرقی زبانوں کے ماہر تھے انہوں نے آزاد کے مشورے سے جدید مشاعروں کا آغاز کیا۔ اس دَوران کرنل ہالرائیڈ نے پنجاب میں تعلیم کے شعبے کو مضبوط کرنے کے لیے انجمن پنجاب کی سرپرستی کا آغاز کیا۔ آغا محمد باقر کی تحقیق کے مطابق انجمن پنجاب کی سرپرستی میں کل دس مشاعرے منعقد کیے گئے جن میں نئی شاعری کے انداز کو فروغ دیا گیا۔ ان مشاعروں میں جدید ادب اور شاعری کے حوالے سے مختلف خیالات کا تبادلہ کیا گیا اور یہ ایک اہم قدم تھا جس نے اُردو شاعری کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔

انجمن پنجاب کے زیرِ اہتمام مختلف مشاعروں کا انعقاد اُردو ادب کے لیے ایک سنگِ میل ثابت ہوا۔ ان مشاعروں نے اُردو شاعری کی ترقی اور اس میں جدیدیت کو فروغ دیا اور خاص طور پر مولانا محمد حسین آزاد اور دیگر اہم شعرا نے ان مشاعروں میں شرکت کر کے اُردو ادب میں نئے رجحانات متعارف کرائے۔ ان مشاعروں کا سلسلہ مختلف موضوعات کے تحت ہوا اور ہر مشاعرہ اپنے مخصوص موضوع کے لحاظ سے منفرد تھا۔ یہاں ان مشاعروں کا تفصیل سے ذکر کیا جا رہا ہے:

﴿پہلا مشاعرہ﴾ :

تاریخ: ۳۰/مئی ۱۸۷۴ء

موضوع: ''برسات''

اہم شعرا: مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، ذوق کاکوروی

آزاد نے اس مشاعرے میں اپنی مثنوی ''شبِ قدر'' پیش کی۔ حالی نے اپنی نظم ''برکھا رُت'' پیش کی۔

﴿دوسرا مشاعرہ﴾ :

تاریخ: ۳۰/جون، ۱۸۷۴ء

موضوع: ''زمستان'' (خزاں)

شعرا کی تعداد: ۹

اہم شعرا: مولانا محمد حسین آزادؔ، شاہ انور حسین ہماؔ، مولوی عطا اللہ، مرزا اشرف بیگ دہلوی، منشی الٰہی بخش رفیقؔ، مولوی قادر بخش، مولوی عمو جان دہلوی وغیرہ۔

﴿تیسرا مشاعرہ﴾ :

تاریخ: ۳/اگست، ۱۸۷۴ء

موضوع: ''اُمید''

شعرا کی تعداد: ۱۰

اہم شعرا: مولانا محمد حسین آزادؔ، مولانا الطاف حسین حالیؔ، مولوی عمو جان دہلوی، مضطر دہلوی، مرزا اشرف بیگ دہلوی، عطا اللہ خان عطا، مرزا احمد بیگ خان فکریؔ، مرزا محمود بیگ راحتؔ وغیرہ۔

﴿چوتھا مشاعرہ﴾ :

تاریخ: ۳/ستمبر، ۱۸۷۴ء

موضوع: ''حبِ وطن''

شعرا کی تعداد: ۱۳

اہم شعرا: مولانا محمد حسین آزادؔ، مولانا الطاف حسین حالیؔ، پنڈت کرشن لال طالبؔ، مولوی محمد اشرف، انور حسین ہما، عطا اللہ خاں عطا، مولوی عمو جان ولیؔ دہلوی، ملا گل محمد ولیؔ اور دیگر۔

﴿پانچواں مشاعرہ﴾ :

تاریخ: ۱۹/اکتوبر، ۱۸۷۴ء

موضوع: ''امن''

شعرا کی تعداد: ۱۱

اہم شعرا: منشی لچھمن داس برہمؔ، مولوی گل محمد عالیؔ، مولوی شاہ محمد صادقؔ، مفتی امام بخشؔ، مصر رام داس قابلؔ، حقیرؔ لکھنوی، عطا اللہ خاں عطا، مولانا محمد حسین آزادؔ، وغیرہ۔

﴿چھٹا مشاعرہ﴾ :

تاریخ: ۱۴/نومبر،۱۸۷۴ء

موضوع: ''انصاف''

شعرا کی تعداد: ۱۳

اہم شعرا: مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، منشی لچھمن داس برہم، مولوی محمد اشرف، محمد اکبر خاور، مولوی محمد فصیح الدین رنج، اصغر علی حقیر لکھنوی، شیخ الٰہی بخش رفیق اور دیگر۔

﴿ساتواں مشاعرہ﴾ :

تاریخ: ۱۱/دسمبر،۱۸۷۴ء

موضوع: ''مروّت''

شعرا کی تعداد: ۱۴

اہم شعرا: مولوی سلطان علاؤالدین محمد قریش، مولوی محمد شریف، منشی لچھمن داس برہم، مولوی عطاءاللہ خان عطا، منشی الٰہی بخش رفیق اور دیگر۔

﴿آٹھواں مشاعرہ﴾ :

تاریخ: ۳۰/جنوری،۱۸۷۵ء

موضوع: ''قناعت''

شعرا کی تعداد: ۱۸

اہم شعرا: لالہ دین دیال عاجز، جوالا سہائے خورم، ڈاکٹر لچھمن داس برہم، بلند لاہوری، شاہ انور حسین ہما، ملا گل محمد عالی، محمد حیات فیض لاہوری، مولوی سلطان علاؤالدین محمد صافی، لالہ تارا چند تارا لاہوری، مصر رام داس قابل اور دیگر۔

﴿نواں مشاعرہ﴾ :

تاریخ: ۱۳/مارچ،۱۸۷۵ء

موضوع: ''تہذیب''

شعرا کی تعداد: ۱۸

اہم شعرا: ڈاکٹر علی محمد خان نے اس مشاعرے کی تاریخ ۲۲/مئی لکھی ہے اور اس کا موضوع ہم دردی بتایا ہے۔ ڈاکٹر علی محمد خان کے مطابق اس مشاعرے میں مولانا آزاد کی شرکت کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا، درست معلوم نہیں ہوتا۔

﴿دسواں مشاعرہ﴾ :

تاریخ: ۳؍ جولائی، ۱۸۷۵ء

موضوع: ''شرافت انسانی''

اہم شعرا: اس مشاعرے میں آزادؔ نے اپنی مثنوی ''شرافت حقیقی'' پیش کی۔ اس مشاعرے کا موضوع ''اخلاق'' ہونے کا ذکر کیا گیا لیکن آزادؔ کی مثنوی سے ''شرافت انسانی'' کا تعلق ثابت ہوتا ہے۔

۱۸۷۵ء کے آغاز میں یہ نئی شاعری کی آواز طلبا کے درمیان بھی پہنچی۔ چنانچہ ۳۰؍ جنوری ۱۸۷۵ء کے مشاعرے میں گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم دین دیال عاجزؔ اور گورنمنٹ ڈسٹرکٹ اسکول لاہور کے طالب علم جوالا پرشاد کانستہ خرّمؔ نے ''قناعت'' کے موضوع پر نظمیں پیش کیں۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس وقت اس نئے شعری رجحان کو کچھ حد تک منفی تنقید کا سامنا تھا۔ مختلف اخبارات نے اس تحریک پر تبصرے کیے اور مولانا آزادؔ کی مخالفت کی جب کہ مولانا حالؔی کے حق میں حمایت کا اظہار کیا۔

اگر ہم شعرا کی اس فہرست کا تفصیل سے تجزیہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ محمد حسین آزادؔ اور الطاف حسین حالؔی کے علاوہ ان مشاعروں میں کوئی ایسا صف اوّل کا شاعر شامل نہیں تھا جو اُردو شاعری کے مروّجہ اصولوں اور روایات کا حصّہ ہو۔ ابتدا میں دہلی کے شعرا نے اس نئے انداز کی شاعری کو خوش دلی سے قبول کیا اور لاہور کے شعرا نے بعد میں اس کی طرف متوجہ ہونا شروع کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتدائی طور پر اس نئی شعری تحریک کو خاصی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اس کے اثرات اور مقبولیت میں وقت لگ رہا تھا۔ مشاعروں کی کامیابی اور اثرات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تحریک ایک ہمہ گیر صورت میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ ڈاکٹر محمد صادق کے مطابق اس ناکامی کا ایک سبب یہ تھا کہ یہ تحریک اپنے وقت سے پہلے تھی اور اس میں جدید نظم نگاری کے اُصولوں کو جڑ پکڑنے میں وقت لگا۔

اس کے باوجود نئی نظم کی لہر آہستہ آہستہ جڑ پکڑنے لگی۔ اگرچہ ۱۸۷۵ء میں انجمن پنجاب کے مشاعرے کا سلسلہ بند کر دیا گیا لیکن نئے انداز کی نظم نگاری کا عمل جاری رہا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نظم میں تبدیلی کی یہ تحریک اپنے راستے پر جاری رہی اور مختلف شعرا نے اس میں نئے تجربات کیے۔ انیسویں صدی کے چوتھے ربع میں عبدالحلیم شرر نے اُردو نظم میں ''دل گداز'' جیسے اثر انگیز کام کے ذریعے اس نئی تحریک کو آگے بڑھایا۔ اس کے بعد بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں شیخ عبدالقادر نے اپنی معروف ادبی اشاعت ''مخزن'' کے ذریعے اردو نظم میں موضوعات اور ہیئت کے نئے تجربات متعارف کروائے۔ اس طرح سے نظم جدید کا سفر جاری رہا اور اس میں مسلسل نئے رجحانات اور انداز متعارف ہوتے گئے جس کی وجہ سے اردو نظم کی ترقی کے امکانات روشن ہوئے اور اس نے نئے آفاق کی طرف رُخ کیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۲۴﴾ انجمن پنجاب کی سرپرستی میں کتنے مشاعرے ہوئے؟

﴿۲۵﴾ انجمن پنجاب کے مشاعروں میں کس قسم کے موضوعات پر شاعری کی جاتی تھی؟

﴿۲۶﴾ ۱۵؍ اگست ۱۸۶۸ء کو انجمن پنجاب کے زیرِ اہتمام ہونے والے اجلاس میں مولانا آزاد نے کس موضوع پر لیکچر دیا؟

﴿۲۷﴾ انجمن پنجاب کے مشاعروں کا آغاز کس نے کیا؟

﴿۲۸﴾ محمد حسین آزاد کا انجمن پنجاب کے مشاعروں میں کیا کردار تھا؟

﴿۲۹﴾ انجمن پنجاب کا پہلا مشاعرہ کب اور کس موضوع پر تھا؟

﴿۳۰﴾ انجمن پنجاب کے پہلے مشاعرے میں کتنے شعرا شریک ہوئے تھے؟

﴿۳۱﴾ محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالؔی کے علاوہ انجمن پنجاب کے مشاعروں میں کون شامل تھا؟

﴿۳۲﴾ انجمن پنجاب کے پہلے مشاعرے میں مولانا آزاد اور مولانا حالؔی نے کون سی مثنوی پیش کی؟

﴿۳۳﴾ انجمن پنجاب کے مشاعروں میں ''قناعت'' کے موضوع پر کس نے نظم پیش کی؟

﴿۳۴﴾ انجمن پنجاب کے مشاعروں کا سلسلہ کب تک جاری رہا؟

﴿۳۵﴾ انجمن پنجاب کے زیرِ اہتمام کس مشاعرے کا موضوع ''حبِ وطن'' تھا؟

﴿۳۶﴾ انجمن پنجاب کے مشاعروں میں کس نے ''شرافت حقیقی'' پیش کی؟

﴿۳۷﴾ مولانا آزاد کے مطابق نظم کا مقصد کیا ہونا چاہیے؟

﴿۳۸﴾ انجمن پنجاب نے شاعری میں کس نئی سمت کی طرف قدم بڑھایا؟

01.06 خلاصہ

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں ادبی وثقافتی سرگرمیاں بحال کرنے کے لیے مختلف انجمنیں قائم کی گئیں جن میں لاہور کی ''انجمن پنجاب'' اہم تھی۔ اس انجمن نے اُردو شاعری میں جدیدیت کا آغاز کیا جس نے شاعری کے موضوعات اور ہیئت میں نئے تجربات متعارف کرائے۔ انجمن پنجاب نے شاعری کو صرف تفریحی نہیں بلکہ سماجی اور فلسفیانہ پیغامات کا وسیلہ بنایا جس سے اُردو ادب میں ترقی کی نئی راہیں کھلیں۔

۱۸۳۵ء میں انگریزی زبان کے نفاذ اور فارسی کے اثرات کے خاتمے سے مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہوئی۔ اُردو کو سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کرنے کے باوجود ۱۸۵۶ء کے بعد انگریزوں اور غیر مسلموں نے ہندی کی حمایت شروع کر دی۔ پنجاب میں اُردو کی گہری جڑوں کے باعث انگریزوں کے لیے اُردو کو ختم کرنا مشکل تھا۔ ۱۸۶۵ء میں ''انجمن پنجاب'' کا قیام ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر کی زیرِ قیادت ہوا جس کا مقصد علمی، ثقافتی ہم آہنگی پیدا کرنا اور اُردو ادب میں جدیدیت کو فروغ دینا تھا۔ انجمن نے نہ صرف اُردو ادب بلکہ سماجی، ثقافتی اور تعلیمی اصلاحات میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر لائٹنر نے اُردو کو جدید علوم کے لیے موزوں زبان کے طور پر پیش کیا اور لاہور کالج کا قیام کیا تا کہ ہندوستانی ثقافت کے مطابق تعلیمی ادارے قائم کیے جا سکیں۔ انجمن پنجاب نے اُردو شاعری میں نئے رجحانات کو متعارف کرایا اور مولانا محمد حسین آزاد نے اُردو ادب کی اصلاح کی اور انگریزی ادب سے استفادہ کی تجویز پیش کی۔

انجمن پنجاب کا قیام محمد حسین آزاد اور ڈاکٹر لائٹنر کی کوششوں کا نتیجہ تھا جس کا مقصد نہ صرف ادبی بلکہ سماجی اصلاحات کی طرف بھی لوگوں کی توجہ مبذول کرانا تھا۔ انجمن کے اغراض ومقاصد میں قدیم مشرقی علوم کا احیاء، صنعت وتجارت کا فروغ، دیسی زبان کے ذریعے علم کی اشاعت اور علمی، ادبی، سماجی وسیاسی مسائل پر بحث شامل تھے۔ انجمن نے مختلف رسائل اور مدارس قائم کرنے کی کوشش کی اور عوامی سطح پر علمی و

ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے جلسے منعقد کیے۔ انجمن پنجاب نے مجلسی تنقید کی پہلی مضبوط روایت کو متعارف کرایا جس سے لوگوں میں فکری گہرائی اور علمی نکتہ چینی کا رجحان پیدا ہوا۔ ان جلسوں میں مشرقی ادب اور علوم پر کھلے دل سے بحث کی جاتی تھی اور اس میں عوام کی شرکت بڑھنے سے انجمن کو حکومتی سطح پر بھی اثر ورسوخ حاصل ہوا۔

انجمن کے زیرِ اہتمام مشاعروں کا آغاز بھی ہوا جو اُردو شاعری میں نئی سمت کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ ان مشاعروں میں نئے شاعری کے انداز کو فروغ دیا گیا اور موضوعات جیسے ''حب وطن''، ''اَمن''، ''انصاف'' اور ''تہذیب'' پر شاعری کی گئی۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ان مشاعروں میں فعال کردار ادا کیا اور اُردو شاعری کی ترقی میں اہم حصہ لیا تاہم ابتدائی طور پر ان مشاعروں کو مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ نئی نظم کی تحریک جڑ پکڑنے لگی اور اُردو ادب میں اس کا اثر دیرپا ثابت ہوا۔ اس کے باوجود انجمن پنجاب کی یہ تحریک اپنے وقت سے پہلے تھی اور جدید نظم نگاری کے اصولوں کو جڑ پکڑنے میں وقت لگا لیکن آخرکار یہ تحریک اردو ادب میں نئے تجربات کی راہ ہموار کرنے میں کامیاب ہوئی۔

01.07 فرہنگ

احیا	: زندہ کرنا (کسی خیال، عقیدے، جذبے وغیرہ کو) نئے سرے سے ابھارنے کی تحریک، تازہ قوت بخشنے یا سرنو رواج دینے کا کام، قائم و برقرار رکھنا	خلیج	: درمیانی فاصلہ یا فرق، دوری، اختلاف
		خودمختار	: بااختیار، خودسر، اپنے عمل پر قادر۔
		دل شکنی	: مایوس کرنا، رنجیدہ کرنا
		رسوخ	: مضبوطی، استحکام۔ ربط ضبط۔ پہنچ۔
اخراجات	: وہ رقم جو خرچ کی جائے۔	رکنیت	: کسی جماعت، انجمن یا ادارے کا ممبر
افہام وتفہیم	: خود سمجھنا اور دوسروں کو بھی سمجھانا، صلاح و مشورہ۔	روابط	: تعلقات، میل ملاپ، لگاؤ، قربتیں۔
		زاویہ	: نظریہ، اندازِ فکر
اقدامات	: پیش قدمیاں، تدبیریں	سمت	: جانب، رُخ، طرف
امر	: کام، مسئلہ	فروغ	: ترقی
انبساط	: خوشی، شادمانی، سرور	فعال	: سرگرمِ عمل، مستعد۔
استوار	: قوت کے ساتھ، مستحکم، مضبوط	فلسفیانہ	: ادق یا آسانی سے نہ سمجھ میں آنے والی بات
انعقاد	: (کسی جلسے یا محفل وغیرہ کا) منعقد کیا جانا	متعارف	: معروف، مشہور، جانا پہچانا
بصیرت	: سمجھ، واقفیت	متمول	: دولت مند، امیر، دھنی
تحسین	: سراہنا، تعریف کرنا، پسند کرنا	متنوع	: قسم قسم کا، طرح طرح کا
ترویج	: چلن، اشاعت	محتاط	: احتیاط سے کیا ہوا، ہوشیار۔
تعطل	: کسی کام کا بند ہو جانا یا رک جانا	مستحکم	: قائم رہنے والا، پائیدار، مضبوط

تقلید	:	پیروی، کسی کے قدم بہ قدم چلنا	مشغول	:	کسی کام میں انہماک سے لگا ہوا، مصروف
توانائی	:	طاقت، زور، بل	مفادات	:	فائدے، بھلائیاں
ثقافت	:	تہذیب، کسی قوم یا گروہ انسانی کی تہذیب کے اعلیٰ مظاہر جو اس کے مذہب، نظام اخلاق، علم و ادب اور فنون میں نظر آتے ہیں۔	وسیع النظر	:	بلند خیال، جس کی نظر میں وسعت ہو۔
			ہم آہنگی	:	مطابقت، ایک دوسرے کے خیالات سے متفق ہونے اور ساتھ دینے کی کیفیت

01.08 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ : انجمن پنجاب کے قیام میں ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر کا کیا کردار تھا؟

سوال نمبر ۲ : انجمن پنجاب کے تحت ہونے والے مشاعروں میں محمد حسین آزاد کا کیا کردار تھا؟

سوال نمبر ۳ : انجمن پنجاب کے مشاعروں میں کون سے اہم موضوعات شامل تھے؟

سوال نمبر ۴ : انجمن پنجاب کا تعلیمی ماڈل کیا تھا؟

سوال نمبر ۵ : انجمن پنجاب نے اُردو ادب کی کس نوعیت کی تبدیلی کی؟

سوال نمبر ۶ : انجمن پنجاب کے ذریعے کون سی سماجی اصلاحات کی گئیں؟

سوال نمبر ۷ : مولانا آزاد نے ۵/اگست ۱۸۵۷ء کے اجلاس میں کس موضوع پر لیکچر دیا؟

سوال نمبر ۸ : پہلی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے کس حکومتی ساخت کی ضرورت محسوس کی؟

سوال نمبر ۹ : انجمن پنجاب کے مشاعروں میں جدید شاعری کی مخالفت کیوں ہوئی؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ : انجمن پنجاب کا قیام کب ہوا اور اس کا مقصد کیا تھا؟

سوال نمبر ۲ : انجمن پنجاب نے اُردو ادب میں کیا کردار ادا کیا؟

سوال نمبر ۳ : انجمن پنجاب کے مقاصد کیا تھے؟

سوال نمبر ۴ : محمد حسین آزاد کا انجمن پنجاب میں کیا کردار تھا؟

سوال نمبر ۵ : اُردو نظم کی ترقی میں انجمن پنجاب کے مشاعروں کا کیا کردار تھا؟

معروضی سوالات

سوال نمبر ۱ : انجمن پنجاب کا قیام کب ہوا؟

(الف) 1857ء　　(ج) 1865ء

(ب) 1860ء　　(د) 1870ء

سوال نمبر۲ : ڈاکٹر لائٹنر نے کس کالج کا قیام عمل میں لایا؟

(الف) دہلی کالج (ج) فورٹ ولیم کالج

(ب) لاہور کالج (د) کلکتہ یونیورسٹی

سوال نمبر۳ : انجمن پنجاب کا ابتدائی نام کیا تھا؟

(الف) انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب (ج) انجمن ثقافتی پنجاب

(ب) انجمن علمی پنجاب (د) انجمن اُردو پنجاب

سوال نمبر۴ : انجمن پنجاب کی وہ اہم شخصیت جس نے مولوی محمد حسین آزاد کو مستقل طور پر لیکچرار مقرر کرنے کی تجویز پیش کی؟

(الف) ڈاکٹر لائنز (ج) بابو نوبین چندر رائے

(ب) ڈاکٹر لائٹنر (د) پروفیسر علمدار حسین

سوال نمبر۵ : انجمن پنجاب کے ابتدائی اجلاسوں میں زیادہ تر شرکاء کون تھے؟

(الف) صرف عوام (ج) صرف طالب علم

(ب) سرکاری ملازمین، رؤسا اور جاگیردار (د) صرف ادبی شخصیات

سوال نمبر۶ : انجمن پنجاب کے جلسوں میں کس نوعیت کی آراء اور تبادلہ خیالات کی اجازت تھی؟

(الف) کھلے دل سے بحث ونظر کی اجازت (ج) صرف حکومتی پالیسیوں پر بات کرنے کی اجازت

(ب) صرف صحت مند تنقید کی اجازت (د) کسی بھی قسم کی تنقید کی اجازت نہیں تھی

سوال نمبر۷ : انجمن پنجاب نے کس نوعیت کے ہفتہ وار پروگرام شروع کیے؟

(الف) صرف علمی مباحثے (ج) ہفتہ وار مباحثے جو علمی وادبی لحاظ سے کامیاب تھے

(ب) سیاسی مباحثے (د) مذہبی مباحثے

سوال نمبر۸ : انجمن پنجاب نے کس طرح عوام میں اپنی آواز بلند کی؟

(الف) صرف تعلیمی اداروں کے ذریعے (ج) سیاسی اجتماعات کے ذریعے

(ب) حکومتی سرپرستی کے ذریعے (د) جلسوں اور رسائل کے ذریعے

سوال نمبر۹ : مولانا محمد حسین آزاد نے 5/اگست 1867ء کو انجمن پنجاب کے اجلاس میں کس موضوع پر لیکچر دیا؟

(الف) نظم اور کلام موزوں (ج) ادب میں اصلاحات

(ب) جدید شاعری کے اصول (د) اُردو نظم کی تاریخ

سوال نمبر۱۰ : انجمن پنجاب کے زیرِ اہتمام پہلی بار مشاعرہ کب منعقد ہوا؟

(الف) 1/جنوری 1874ء (ج) 13/مارچ 1875ء

(ب) 30/مئی 1874ء (د) 19/اکتوبر 1874ء

سوال نمبر۱۱ : انجمن پنجاب کے مشاعروں میں مولانا آزاد کے علاوہ کون اہم شخصیت شریک تھے؟

(الف) مولانا الطاف حسین حالؔی (ج) مرزا غالبؔ

(ب) علامہ اقبالؔ (د) خواجہ میر دردؔ

سوال نمبر۱۲ : انجمن پنجاب کے زیرِ اہتمام کس مشاعرے کا موضوع ''تہذیب'' تھا؟

(الف) پہلا مشاعرہ (ج) ساتواں مشاعرہ

(ب) چھٹا مشاعرہ (د) نواں مشاعرہ

سوال نمبر۱۳ : انجمن پنجاب کے مشاعروں میں نئی شاعری کی تحریک کو کس نے فروغ دیا؟

(الف) مولانا محمد حسین آزادؔ (ج) الطاف حسین حالؔی

(ب) ڈاکٹر لائٹنر (د) مرزا غالبؔ

سوال نمبر۱۴ : انجمن پنجاب کے مشاعروں کا سلسلہ کب بند کیا گیا؟

(الف) 1874ء (ج) 1880ء

(ب) 1875ء (د) 1885ء

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ج) 1865ء

جواب نمبر۲ : (ب) لاہور کالج

جواب نمبر۳ : (الف) انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب

جواب نمبر۴ : (ب) ڈاکٹر لائٹنر

جواب نمبر۵ : (ب) سرکاری ملازمین، رؤسا اور جاگیردار

جواب نمبر۶ : (الف) کھلے دل سے بحث ونظر کی اجازت

جواب نمبر۷ : (ج) ہفتہ وار مباحثے جو علمی وادبی لحاظ سے کامیاب تھے

جواب نمبر۸ : (د) جلسوں اور رسائل کے ذریعے

جواب نمبر۹ : (الف) نظم اور کلام موزوں

جواب نمبر۱۰ : (ب) 30/مئی 1874ء

جواب نمبر۱۱ : (الف) مولانا الطاف حسین حالؔی

جواب نمبر۱۲ : (د) نواں مشاعرہ

جواب نمبر۱۳ : (الف) مولانا محمد حسین آزادؔ

جواب نمبر۱۴ : (ب) 1875ء

01.09 حوالہ جاتی کتب

۱۔ انجمن پنجاب تاریخ وخدمات از ڈاکٹر صفیہ بانو

۲۔ انجمن پنجاب کے مشاعرے از عارف ثاقب

۳۔ اُردو ادب کی تحریکیں (ابتدا سے ۱۹۷۵ تک) از ڈاکٹر انور سدید

۴۔ اُردو ادب کی مختصر تاریخ از ڈاکٹر انور سدید

۵۔	تاریخ ادب اُردو	از	رام بابو سکسینہ
۶۔	تاریخ ادب اُردو	از	ڈاکٹر جمیل جالبی
۷۔	تاریخ ادب اُردو (ابتدا سے ۲۰۰۰ تک)	از	وہاب اشرفی
۸۔	اُردو ادب کی تاریخ	از	عظیم الحق جنیدی

01.10 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب۔

﴿۲﴾ پنجاب میں۔

﴿۳﴾ اس نے اُردو ادب کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا اور اس کے فروغ میں مدد کی۔

﴿۴﴾ مولانا محمد حسین آزاد

﴿۵﴾ ۲۱/جنوری ۱۸۶۵ء

﴿۶﴾ ۱۸۳۵ء میں۔

﴿۷﴾ بنگال، سی پی، بہار اور یو پی میں۔

﴿۸﴾ مختلف کمیونٹیز کے درمیان باہمی سمجھ بوجھ اور ثقافتی ہم آہنگی پیدا کرنا۔

﴿۹﴾ مسلمانوں میں بے چینی اور غیر یقینی کی صورتحال پیدا ہوئی۔

﴿۱۰﴾ اس نے جدید اُردو شاعری کو فروغ دیا خصوصاً مشاعروں کے ذریعے۔

﴿۱۱﴾ وہ ہندوستانی ثقافت اور روایات کو برطانوی تعلیمی نظام سے الگ رکھنے کے حامی تھے۔

﴿۱۲﴾ محمد حسین آزاد اور ڈاکٹر لائٹنر۔

﴿۱۳﴾ اُردو زبان۔

﴿۱۴﴾ ۱۸۶۵ء میں لاہور سے۔

﴿۱۵﴾ ادبی اور سماجی اصلاحات کو فروغ دینا۔

﴿۱۶﴾ قدیم مشرقی علوم کا احیاء، صنعت و تجارت کا فروغ، اور دیسی زبان میں علوم کی اشاعت۔

﴿۱۷﴾ مستقل لیکچرار۔

﴿۱۸﴾ مضامین پر کھلے دل سے بحث و نظر کی آزادی۔

﴿۱۹﴾ سرکاری ملازمین، رؤسا اور جاگیردار۔

﴿۲۰﴾ عوام کو جلسہ عام میں شرکت کی آزادی تھی۔

﴿۲۱﴾ اُردو ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا اور انجمن کو فعال بنایا۔

﴿۲۲﴾ علمی و ادبی سرگرمیوں کا فروغ۔

﴿۲۳﴾ مدارس، کتب خانے اور دارالمطالعہ قائم کر کے۔

﴿۲۴﴾ دس مشاعرے۔

﴿۲۵﴾ مختلف موضوعات جیسے حبِ وطن، انصاف، امن، قناعت وغیرہ۔

﴿۲۶﴾ ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات''۔

﴿۲۷﴾ ڈاکٹر لائٹنر نے لیکن یہ حکومت کے ایما پر شروع ہوئے تھے۔

﴿۲۸﴾ وہ مشاعروں کے سیکرٹری تھے۔

﴿۲۹﴾ ۳۰ رمئی ۱۸۷۴ء، ''برسات''۔

﴿۳۰﴾ تین اہم شعرا شریک ہوئے تھے۔

﴿۳۱﴾ دہلی اور لاہور کے کچھ دیگر شعرا۔

﴿۳۲﴾ مولانا آزاد نے ''شبِ قدر'' اور مولانا حالی نے ''برکھارُت''۔

﴿۳۳﴾ دین دیال عاجز اور جوالا پرشاد نے۔

﴿۳۴﴾ ۱۸۷۵ء تک۔

﴿۳۵﴾ چوتھے مشاعرے۔

﴿۳۶﴾ مولانا محمد حسین آزاد نے۔

﴿۳۷﴾ نظم کو محض تفریحی نہیں بلکہ اصلاحی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔

﴿۳۸﴾ شاعری کو سماجی اصلاحات اور تہذیبی ترقی کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔

اکائی 02 علی گڑھ تحریک

ساخت

02.01 : اغراض ومقاصد
02.02 : تمہید
02.03 : علی گڑھ تحریک کا تعارف
02.04 : علی گڑھ تحریک کا بنیادی تصور
02.05 : علی گڑھ تحریک کے اردو زبان وادب پر اثرات
02.06 : خلاصہ
02.07 : فرہنگ
02.08 : نمونہ امتحانی سوالات
02.09 : حوالہ جاتی کتب
02.10 : اپنے مطالعے کے جانچ کے جوابات

02.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کی مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ اردو ادب کی ایک اہم تحریک ''علی گڑھ تحریک'' پر گفتگو کر سکیں۔ اردو ادب کے اہم رجحان پر روشنی ڈال سکیں۔ اس تحریک کے رجحان کا پس منظر بیان کر سکیں۔ اس تحریک کے رجحانات کے اساسی تصوّرات کا تجزیہ کر سکیں۔ اس تحریک اور رجحان کے مقاصد و مدعا پر اظہار خیال کر سکیں۔ اردو ادب پر اس تحریک اور رجحان کے اثر کی نشان دہی کر سکیں۔

02.02 تمہید

ادب کو زندگی کا آئینہ کہا گیا ہے کیوں کہ زندگی کے حقائق و واقعات کا عکس ادب میں نظر آتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ زندگی کبھی ایک ڈھرّے پر قائم نہیں رہتی۔ اس میں ہمیشہ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ زندگی کی ان تبدیلیوں کا اَثر ادب پر بھی پڑتا ہے اور اب بھی بدلتا رہتا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جہاں وہ زندگی سے مؤثر ہوتا ہے وہیں زندگی کو متاثر بھی کرتا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینے اور ادب کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً شعری یا غیر شعوری کوششیں بھی کی گئیں۔ یہ کوشش اگر منصوبہ بند اور منظّم ہو تو اسے تحریک اور غیر منصوبہ بند اور اتفاقی ہو تو اسے رجحان کہتے ہیں۔ اردو ادب میں بھی مختلف وقتوں میں مختلف تحریکیں اُٹھیں اور مختلف رجحانات نمودار ہوئے جیسے علی گڑھ تحریک، ترقی پسند تحریک، حلقۂ ارباب ذوق اور جدیدیت کا رجحان وغیرہ۔ اس اکائی میں ایک اہم تحریک ''علی گڑھ تحریک'' کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کریں گے۔

02.03 علی گڑھ تحریک کا تعارف

علی گڑھ تحریک اردو کی اہم تحریکوں میں سے ایک ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر تحریک تھی جس نے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے مختلف شعبوں میں دیرپا اور دُور رَس اثرات چھوڑے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ ایک تعلیمی تحریک تھی لیکن چوں کہ اس کا مزاج اصلاحی تھا اس لیے اس کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور تہذیبی مضمرات بھی تھے جن کی تشہیر کے لیے ادبی وسائل سے بھی کام لیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس تحریک کے دَوران اُردو شعروادب کو بھی ایک نئی سمت ملی۔ چوں کہ علی گڑھ تعمیری واصلاحی نظریات اور ذہنی وفکری نشاۃ ثانیہ کا مرکز تھا اس لیے اس تحریک کو علی گڑھ تحریک کا نام دیا گیا۔ سرسید اس تحریک کی مرکزی شخصیت اور روحِ رواں تھے اس لیے اسے سرسید تحریک بھی کہا جانے لگا۔ اس تحریک کا باقاعدہ آغاز سرسید احمد خاں کی انگلستان سے واپسی کے بعد ۱۸۷۰ء میں رسالہ تہذیب الاخلاق کے اجرا سے ہوا لیکن درحقیقت اس کی ابتدا اسی وقت ہو چکی تھی جب انہوں نے غازی پور میں ایک انگریزی اسکول اور سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی تھی جو بعد میں علی گڑھ منتقل ہوگئی۔

02.04 علی گڑھ تحریک کا بنیادی تصوّر

علی گڑھ تحریک اصلاً ایک اصلاحی تحریک تھی۔ اس کا مقصد مسلمانوں میں پائے جانے والے عیوب ونقائص کو دُور کر کے انھیں فلاح و بہبود کی راہ پر گامزن کرنا تھا۔ سرسید احمد خاں کی تحریک کے بانی اور سالارِ کارواں تھے۔ وہ مسلمانوں کو دَورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے قوم کے سامنے دو باتیں رکھیں۔ ایک یہ کہ فرسودہ روایات، بے ہودہ رسم ورواج، توہم پرستی اور خرافات کو چھوڑ دیں دوسرے یہ کہ انگریزی زبان اور اس کے توسط سے جدید علوم فنون سے اپنا رشتہ جوڑیں۔ سرسید کا عہد مسلمانوں کی پستی اور انتشار کا عہد تھا۔ اس دَور کے مسلمانوں میں دنیا بھر کی برائیاں، خرابیاں اور عیوب موجود تھے۔ ان میں بے عملی اور بے حسی تھی، جہالت سستی اور کاہلی تھی، تعصب تھا، خوشامد اور ظاہر داری تھی۔ ریاکاری اور چاپلوسی تھی اخلاق وشرافت اور تہذیب ومعاشرت کا کوئی معیار ان میں باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ان تمام خرابیوں اور برائیوں کے باوجود زعم یہ تھا کہ ہم سب سے برتر ہیں کوئی ہماری برابری نہیں کرسکتا۔

مغربی تعلیم اور جدید علوم سے مسلمانوں کو سخت نفرت تھی۔ ان کا خیال تھا کہ انہوں نے انہیں اقتدار سے محروم کیا تھا۔ انگریزوں کو وہ نجس سمجھتے تھے اور انگریزی تعلیم کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ مذہب سے منحرف کرنے اور عیسائی بنانے کی ترکیب ہے۔ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں نے زیادہ دُور اندیشی اور ذہانت کا ثبوت دیا اور انہوں نے مغربی علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی لیکن مسلمانوں نے سائنسی علوم کو اپنے مذہب کا دشمن سمجھا اور ان سے گریز کیا۔ مغربی علوم وفنون کے بارے میں مسلمانوں کے جو شکوک وشبہات تھے ان کو دُور کرنا آسان کام نہ تھا۔ اسی طرح ادب میں بھی مختلف اصناف سخن کی جو ہیئتیں اور موضوعات مقرر ہو چکے تھے ان سے ہٹنے اور ان میں کسی طرح کی تبدیلی لانے کو گوارا نہیں کیا جاتا تھا۔ سرسید نے ان تمام نقائص اور برائیوں کے خلاف چومکھی لڑائی لڑی۔ انہوں نے مسلمانوں کو سماجی، تہذیبی، اخلاقی، علمی اور اقتصادی پستی سے نکالنے کے لیے چند نسخے تجویز کیے جنھیں اس تحریک کی فکری بنیادیں کہا جاسکتا ہے۔

علی گڑھ تحریک کی پہلی نظریاتی اساس یا فکری بنیاد، مادیت اور ترقی پر زور ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد کی ناکامی کے بعد سرسید احمد خاں سمجھ چکے تھے اب ہندوستانی مسلمانوں کے لیے تلوار کے زور سے عزت واقتدار حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان کے لیے اگر عزت واقتدار کا کوئی راستہ ہے تو وہ مادّی خوش حالی کا ہے اور مادی خوش حالی مغربی علوم وفنون کے حصول اور وقت کی رفتار سے ساتھ چلنے ہی سے حاصل ہوسکتی

ہے۔اس لیے انگریزوں کی مخالفت چھوڑ کر ان کے علوم سے استفادہ ضروری ہے۔انہوں نے یہ بھی کوشش کی کہ انگریزوں کے ذہن سے مسلم دشمنی کے جذبات اور مسلمانوں سے خطرہ لاحق ہونے کا احساس دُور کریں۔مسلمانوں کے دامن پر لگے بغاوت کے داغ کو دُور کرنے کے لیے انہوں ''تاریخِ سرکشی بجنور''اور''اسبابِ بغاوتِ ہند'' جیسی کتابیں لکھیں۔مسلمانوں کو برطانوی حکومت کا وفادار بتانے کے لیے انہوں نے ''دی لائل محمڈنز آف انڈیا'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس میں ان مسلمانوں کے حالات تحریر کیے جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں برطانوی حکومت کی تائید کی تھی۔

علی گڑھ تحریک کی دوسری فکری اساس عقلیت پسندی تھی سرسید کا خیال تھا کہ مذہبی اُمور میں عقلی اور استدلالی اندازِ نظر ضروری ہے۔ اندھی تقلید وقت کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی۔اس نظریے کے تحت انھوں نے مذہبی معاملات میں تجدد پسند انداز اختیار کیا اور اسلامی عقائد کی ترقی پسندانہ تشریح کی۔انھوں نے مغربی علوم کے مطابق اسلامی اُصولوں کو ڈھالنے کی کوشش کی جس کی شدید مخالفت ہوئی۔ادب میں بھی انھوں نے عقلیت پر اصرار کی اور ادب کو نیچر سے قریب ہونے کا مشورہ دیا۔وہ چاہتے تھے کہ شعر وادب کی بنیاد جذبے کے بجائے عقل پر رکھی جائے اور ہیئت پر موضوع کو ترجیح دی جائے اور مبالغہ کی جگہ حقیقت اور اصلیت کو پیش نظر رکھا جائے۔

علی گڑھ تحریک کی تیسری فکری بنیاد اس کا تصوّر اجتماعیت ہے۔سرسید احمد خاں اجتماعیت کا ایک نہایت متوازن تصوّر رکھتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ یہ وقت انفرادی کوششوں یا کسی فردِ واحد کے فائدے کے لیے جدوجہد کا وقت نہیں ہے بلکہ ایک قومی اور ملی شعور کے ساتھ قوم و ملت کے مفاد کی خاطر پوری ملت کے حرکت میں آنے کا وقت ہے۔تعلیم کا عمل بھی ان کے ہاں انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی سطح پر تھا۔وہ دو چار افراد کی اعلیٰ تعلیم کے قائل نہیں تھے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ قومی پیمانے پر تعلیم کی اشاعت ہو اور اس کے ذریعے پوری قوم بیدار ہو۔

02.05 علی گڑھ تحریک کے اردو زبان وادب پر اثرات

علی گڑھ تحریک نے زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح اردو ادب کو بھی متاثر کیا۔سرسید ایک مصلح تھے۔وہ ادب کو قومی اصلاح کا وسیلہ بنانا چاہتے تھے۔ان کے اس رجحان نے زندگی اور شعر وادب کے درمیان گہرے تعلق کا تصوّر بیان کیے جانے چاہیں تاکہ معاشرے کو اس سے فائدہ پہنچے۔اس طرح علی گڑھ تحریک نے پہلی مرتبہ ادب کے اصلاحی اور افادی تصوّر پر زور دیا۔

علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو ادب میں بعض نئے موضوعات اور نئے عناوین پر پہلی مرتبہ قلم اُٹھایا گیا ان موضوعات میں زندگی کے حقائق، نیچر یا قدرت سے ان کی مطابقت، عمل اور ترقی کی اہمیت، انسان اور معاشرے کا تعلق، عقل و دانش کی برتری اور شعر وادب اور تمدّن و معاش کا ربط و تعلق وغیرہ شامل ہیں۔ان موضوعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ علی گڑھ تحریک ادب کو عام زندگی کا ترجمان اور معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنانا چاہتی تھی۔

علی گڑھ تحریک نے اردو زبان وادب کو مغربی شعر وادب سے فیض یاب کرنے کے سلسلے میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔سرسید کے رفقا الطاف حسین حالؔی، نذیر احمد، شبلی نعمانی، وقار الملک، محسن الملک، محمد حسین آزاد وغیر ان کی اس تحریک کے دست و جزو تھے۔بعد کے زمانے میں اس ہمہ گیر تحریک سے وابستہ ہونے والے شاعروں، ادیبوں میں وحیدالدین سلیم، نواب عمادالملک، عبدالحلیم شرر، نواب صدر یار جنگ، مولوی عبدالحق اور ظفر علی خاں وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

علی گڑھ تحریک کا ایک اہم کارنامہ اردو میں سادہ نثر نگاری کو فروغ دینا بھی ہے۔فورٹ ولیم کالج کی کوششوں اور غالب کے مکاتیب کی مقبولیت کے باوجود اردو نثر ابھی تک فارسی نثر کے زیرِ اثر تھی۔ عام بول چال کی زبان کو تحریر میں استعمال کرنے کی مہم چلائی۔ان کی اس تحریک کا مقصد عبارت آرائی اور تصنّع سے گریز کرتے ہوئے خیالات کو عام فہم لیکن موثر انداز میں پیش کرنا تھا۔ دوسرے الفاظ میں خیال کو بنیادی اہمیت دی گئی اور صنائع وبدائع اور دیگر لوازمات کو ثانوی درجہ دیا گیا۔سرسید احمد خاں نے اپنے اصلاحی خیالات اور تعمیری فکر کے اظہار کے لیے فطری طور پر اردو زبان کا استعمال کیا۔انہوں نے سیدھی نثر لکھی۔ چوں کہ سرسید کا یہ سیدھا سادہ اُسلوب نہایت طاقتور اور پر اثر تھا اس لیے نہ صرف ان کے رفقا بلکہ مخالفین نے بھی غیر شعوری طور پر ان کے اسلوب کی پیروی کی۔اس طرح رفتہ رفتہ اردو میں نثر کا سلیس وسادہ اسلوب رائج ہوگیا۔علی گڑھ تحریک کی بدولت انگریزی ادب کی بعض اصناف اردو میں مروّج ہوگئیں۔سرسید نے انگریزی کے مشہور ادیبوں ایڈیسن اور اسٹیل کی تقلید میں مختلف سماجی ،اخلاقی ،علمی ، دینی اور سیاسی مسائل پر خود بھی مضامین لکھے اور اپنے رفقا سے بھی لکھوائے۔اس طرح مختصر مضمون اور انشائیے کی اصناف اردو میں رواج پانے لگے۔ان کے علاوہ سرسید اور ان کی جماعت نے اپنے عالمانہ اور تحقیقی نگارشات کے ذریعہ اردو کو جو علمی اعتبار سے اس وقت تک ایک بے مایہ زبان تھی تھوڑے ہی عرصے میں اعلیٰ علمی جواہر پاروں سے مالا مال کردیا۔ان مضامین ومقالات کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں ایک طرف سائنٹفک انداز اور عقلیت پرستی پر زور دیا جاتا اور دوسری طرف غیر ضروری لفاظی اور عبارت آرائی سے پرہیز کیا جاتا تھا۔اسلوب کی سادگی اور تاثر کی فراوانی اس طرزِ تحریر کی بنیادی خصوصیت تھی۔

علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو ادب میں کئی اصناف کو فروغ حاصل ہوا جیسے سوانح اور سیرت نگاری کا اردو میں رواج تو تھا لیکن علی گڑھ تحریک نے سائنٹفک اور تحقیقی سوانح نگاری پر زور دیا۔حاؔلی اور شبلؔی علی گڑھ تحریک سے وابستہ عظیم سوانح نگار تھے۔حاؔلی نے یادگارِ غالب، حیاتِ سعدی اور حیاتِ جاوید جیسی معیاری سوانح عمریاں قلم بند کیں۔شبلی نے تاریخ اور علم الکلام سے متعلق شبلی نے دو سوانح عمریاں لکھیں۔ الغزالی اور سوانح مولانا روم۔تاریخ نگاری میں خود سرسید،شبلی اور ذکاءاللہ نے اہم کام انجام دیئے۔

سرسید نے آئینِ اکبری ،تاریخِ فیروز شاہی اور تزکِ جہانگیری کی تدوین کی اور آثار الصنادید جیسی لازوال کتاب لکھی۔شبلی نے تاریخی سوانح عمریوں کے علاوہ متعدد تاریخی مضامین لکھے اور سیرت النبی ﷺ کی پہلی جلد بھی تیار کی اور بعد کی جلدیں ان کے انتقال کے بعد ان کے شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھیں۔ذکاءاللہ نے تاریخِ انگلستان اور تاریخِ ہند کے موضوع پر کتابیں لکھیں۔

تنقید میں حالی کا مقدمۂ شعر وشاعری جو اردو کی پہلی تنقیدی کتاب ہے علی گڑھ تحریک کے اثرات کی دین ہے۔اس طرح شبلی نے بھی شعرالعجم میں شاعری کے متعلق اپنے خیالات پیش کئے۔ناول نگاری کی صنف میں ڈپٹی نذیر احمد ایک اہم ناول نگار کی حیثیت سے اُبھرے جنھوں نے کئی اصلاحی ناول لکھے جیسے مرآۃ العروس ،توبتہ النّصوح ، بنات النّعش ،محصنات ،ابن الوقت ،رویائے صادقہ ،ایامٰی وغیرہ۔

حاؔلی نے بھی مجالس النساء کے نام سے ایک ناول لکھا۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اخلاقی اور سماجی بلکہ سیاسی موضوعات پر بھی شعر گوئی کا رجحان پیدا ہوا۔اس طرح قومی شاعری کی داغ بیل پڑی جو قومی بیداری میں معاون ثابت ہوئی۔حاؔلی، شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد نے سرسید کی فرمائش پر قوم کو بیداری کا پیغام دینے والی نظمیں لکھیں اس طرح اردو میں نیچرل شاعری اور قومی نظموں کے فروغ میں علی گڑھ تحریک نے ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ علی گڑھ تحریک کیسی تحریک تھی؟

﴿۲﴾ علی گڑھ تحریک کی پہلی فکری بنیاد کیا تھی؟

﴿۳﴾ مسلمانوں کو انگریزوں کا وفادار بننے کے لیے سرسید نے کون سا رسالہ جاری کیا؟

﴿۴﴾ سرسید ادب سے کیا کام لینا چاہتے تھے؟

﴿۵﴾ یادگارِ غالب کس کی تصنیف ہے؟

﴿۶﴾ علی گڑھ تحریک کے اہم ناول نگار کون تھے؟

02.06 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے اردو ادب کی ایک اہم تحریک ''علی گڑھ تحریک'' کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔علی گڑھ تحریک ایک اصلاحی تحریک تھی۔اس کے بانی سرسید احمد خاں تھے جو ہندوستانی مسلمانوں کے بہت بڑے مصلح تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستانی مسلمانوں کو بڑی تباہی اُٹھانی پڑی۔سرسید نے مسلمانوں کی حالت کو سدھارنے کے لیے زندگی بھر جدوجہد کی۔یہی جدوجہد علی گڑھ تحریک کہلاتی ہے۔علی گڑھ تحریک ایک اصلاحی تحریک تھی جس نے جدید علوم کے حصول اور عقلیت پسندی پر زور دیا۔سرسید نے مسلمانوں کو فرسودہ روایت ترک کرنے اور خوابِ غفلت سے بیدار ہونے کا مشورہ دیا۔انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں میں ملی شعور بیدار کیا اور ان میں فکر وعمل کا جذبہ پیدا کیا۔علی گڑھ تحریک اور سرسید کی کوششیں کسی ایک میدان تک محدود نہیں تھیں بلکہ تہذیب و معاشرت،اخلاق وادب،مذہب،تعلیم،سیاست اور ادب ہر شعبۂ جات کو اس نے متاثر کیا۔

علی گڑھ تحریک نے اردو زبان وادب پر بھی گہرے اور دُور رَس اثرات چھوڑے۔اَدب میں پر تکلف زبان و بیان اور آرائشی اُسلوب کے بجائے سیدھی سادی زبان اور خیال ومواد کی اہمیت پر زور دیا۔مغربی علوم کے ساتھ مغربی ادب سے استفادہ کرنے اس کی خوبیوں کو اپنانے اور اپنے اپنے ادب کی خامیوں کو دُور کرنے کی تلقین کی۔علی گڑھ تحریک کے زیر اثر کئی جدید اصناف رائج ہوئیں۔علی گڑھ تحریک سے وابستہ مصنّفین میں سرسید احمد خان کے علاوہ حالؔی،ذکاءاللہ اور ڈپٹی نذیر احمد اہم ہیں۔نثر کی ترقی کے ساتھ ساتھ اردو میں نیچرل شاعری اور قومی نظموں کے فروغ میں علی گڑھ تحریک نے اہم حصہ لیا۔حالؔی وشبلؔی کی تنقیدی نگارشات بھی اسی تحریک کا راست یا بالواسطہ نتیجہ ہیں۔

02.07 فرہنگ

اِجرا	: کسی رسالے یا اخبار کا جاری ہونا	رائج	: مقبولِ عام،دستور یا معمول کے مطابق،مروج
استفادہ	: فائدہ اُٹھانا،حصولِ منفعت،نفع پانا	روحِ رواں	: وہ شخص جس پر کسی بات کا دارومدار ہو
اُسلوب	: روشِ تحریر،اندازِ نگارش	ریا کاری	: مکاری،دھوکے بازی،فریب
اقتدار	: قدرت،طاقت،حکومت	سالارِ کارواں	: کسی جماعت یا گروہ کا سربراہ،سردار،افسرِ اعلیٰ
اِقتصادی	: معاشی،مالیاتی،آمد وصرف		

بانی	:	بنیاد رکھنے والا، آغاز کرنے والا	طرزِ تحریر	:	لکھنے کا ڈھنگ، تحریر کا طریقہ
تجدّد	:	نیا پن، نیا ہونا، نئی بات، جدت پسندی	عیوب	:	عیب کی جمع، بہت سارے عیب، برائیاں
ترجیح	:	فوقیت، فضیلت، برتری	فلاح و بہبود	:	فائدہ اور بھلائی
تشہیر	:	شہرت پانا، ڈھنڈورا پیٹنا، منادی کرنا، مشہور کرنا	لازوال	:	جس کو زوال نہ ہو، مستقل، ہمیشہ رہنے والا
			متوازن	:	متعدل، متناسب، موزوں
توہم پرستی	:	خلافِ عقل باتوں کو ماننا	مرکزی شخصیت	:	بنیادی آدمی، اہم آدمی، خاص آدمی
تہذیبی	:	تہذیب سے منسوب یا متعلق	مصلح	:	اصلاح کرنے والے، درست کرنے والے
چاپلوسی	:	خوشامد، چرب زبانی	منحرف	:	برگشتہ، پھر جانے والا
خرافات	:	خرافت کی جمع، خرابی، برائی، بے معنی چیز	منصوبہ بند	:	لائحہ عمل کے مطابق، منصوبہ کے مطابق
داغ بیل پڑنا	:	بنیاد رکھنا، اِبتدا کرنا، پہل کرنا	ناقابلِ فراموش	:	جو بھلایا نہ جا سکے، یاد رہنے والا
دَورِ جدید	:	نیا زمانہ، موجودہ زمانہ	نشاۃ ثانیہ	:	نئی زندگی، حیاتِ نَو
دُوررَس	:	دُور تک اثر انداز ہونے والا	نقائص	:	نقص کی جمع، عیوب، برائیاں، کھوٹ
دیرپا	:	دیر تک قائم رہنے والا، مستحکم، پائدار، مضبوط	نمودار	:	ظاہر، آشکار، عیاں، واضح، نمایاں

02.08 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : علی گڑھ تحریک سے کیا مراد ہے؟

سوال نمبر۲ : علی گڑھ تحریک کی پہلی فکری بنیاد کیا تھی؟ بتائیے۔

سوال نمبر۳ : علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلوؤں کی وضاحت کیجیے۔

ب: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : علی گڑھ تحریک کے بنیادی تصوّر پر ایک مضمون لکھیے۔

سوال نمبر۲ : علی گڑھ تحریک سے وابستہ مصنّفین کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۳ : اردو زبان و ادب پر علی گڑھ تحریک کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ رقم کیجیے۔

سوال نمبر۴ : علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر اردو ادب میں کن اصناف کو فروغ حاصل ہوا؟ اپنی معلومات پیش کیجیے۔

02.09 حوالہ جاتی کتب

۱۔ ادبی تحریکیں از انور سدید

۲۔ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ از منظر اعظمی

۳۔	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	از	خلیل الرحمٰن اعظمی
۴۔	جدیدیت، تجزیہ و تفہیم	از	مظفر حنفی

02.10 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ اصلاحی

﴿۲﴾ مادیت اور ترقی پسندی

﴿۳﴾ دی لائل محمڈنز آف انڈیا

﴿۴﴾ قومی اصلاح کا

﴿۵﴾ حالی کی

﴿۶﴾ ڈپٹی نذیر احمد

اکائی 03 ترقی پسند تحریک

ساخت

03.01 : اغراض ومقاصد
03.02 : تمہید
03.03 : ترقی پسند تحریک کا پس منظر
03.04 : ترقی پسند تحریک کا آغاز
03.05 : ترقی پسند تحریک کے مقاصد
03.06 : ترقی پسند تحریک کے اردو زبان وادب پر اثرات
03.07 : خلاصہ
03.08 : فرہنگ
03.09 : نمونہ امتحانی سوالات
03.10 : حوالہ جاتی کتب
03.11 : اپنے مطالعے کے جانچ کے جوابات

03.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ مندرجہ ذیل موضوع کا مطالعہ حاصل کریں گے:

اس اکائی کی قرأت کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ اردو ادب کی تحریکات میں سے ایک اہم تحریک ''ترقی پسند تحریک'' سے روبرو ہوسکیں۔ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے اہم رجحان اور اس تحریک کے پس منظر کو بیان کرسکیں۔ اس تحریک کے ادبی رجحان کے مقاصد و مدعا پر اظہارِ خیال کرسکیں۔ اردو ادب پر اس تحریک اور رجحان کے اثر کی نشان دہی کرسکیں۔

03.02 تمہید

علی گڑھ تحریک کے بعد ترقی پسند تحریک اردو ادب کی دوسری اہم اور سب سے بڑی اور سب سے منظّم ادبی تحریک تھی۔ اس تحریک کی کوششیں شعوری اور مقاصد واضح تھے۔ علی گڑھ تحریک کی طرح ترقی پسند تحریک نے بھی ادب اور فن کے مختلف شعبوں کو متاثر کیا۔ ترقی پسند تحریک اردو ادب کی اوّلین تحریک تھی جس کے لیے ایک باضابطہ منشور تحریر کیا گیا اور جماعتی انداز میں ادب کی تخلیق کے بارے میں ایک فیصلہ نافذ کیا گیا۔

آیئے اب ہم اس تحریک کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرتے ہیں۔

03.03 ترقی پسند تحریک کا پس منظر

ہمارے ملک کی جدوجہدِ آزادی اور بعض بین الاقوامی تبدیلیوں اور انقلابات کے پس منظر میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا جس کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

یوں تو ہندوستان میں سیاسی اور قومی بیداری کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا لیکن ملک میں انگریزی تعلیم کی اشاعت کے بعد اسے ایک نئی جہت اور نئی توانائی حاصل ہوئی۔ انگریزی تعلیم نے جمہوری خیالات کے لیے راہ ہموار کی۔ مغربی تعلیم یافتہ نوجوان یورپ میں جمہوریت اور شہری حقوق کے جو تصوّرات تھے انھیں ہندوستان میں بھی رائج کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ نئی تعلیم کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ ہندوستان کی نئی نسل نے قومیت کے جدید تصوّر کی تشکیل کی تھی۔ غیر ملکی اقتدار کا تسلط، معاشی استحصال اور تہذیبی زوال کا احساس عام ہوتا جا رہا تھا۔ ان حالات میں ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔

ہندوستان کی قومی تحریک میں ابتدا ہی سے دو طرح کے لوگ تھے۔ ایک شدت پسند جو عوام کے باغیانہ جوش و جذبے کی ترجمانی کرتے تھے۔ دوسرے وہ جو مصلحت پسندی اور صلح و آشتی کے ساتھ اپنے حقوق منوانا چاہتے تھے۔ پہلے گروہ کو انتہا پسند اور دوسرے گروہ کو اعتدال پسند کا نام دیا گیا۔ ۱۹۰۸ء میں بال گنگا دھر تلک کو جو انتہا پسندوں کے رہنما تھے اپنے اخبار میں ایک باغیانہ مضمون لکھنے کے جرم میں چھ سال کی سزائے قید دی گئی۔ تلک کی گرفتاری کا زبردست ردِّعمل ہوا۔ بمبئی میں کپڑے کے کارخانوں کے مزدوروں نے تلک کی تائید میں ہڑتال کی بنگال میں بھی جگہ جگہ ہنگامے ہوئے لیکن پولیس نے اس تحریک کو کچل دیا۔

۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی۔ کانگریس کے اعتدال پسندوں نے اس اُمید پر انگریزوں کی تائید کی کہ جنگ کے بعد انگریز حکومت ہندوستانیوں کو زیادہ سے زیادہ حقوق و مراعات دے گی لیکن جنگ کے بعد حکومت کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کے ردِعمل میں ہر جگہ ہڑتالیں ہونے لگیں جن میں تقریباً پندرہ لاکھ مزدوروں نے حصہ لیا۔ کچھ عرصہ بعد برطانوی حکمرانوں نے ہندوستان میں رولٹ ایکٹ نافذ کیا جس کے خلاف جلوس نکالے گئے۔ اسی طرح کے ایک جلسے پر جو جلیانوالہ باغ میں منعقد ہوا جنرل ڈائر نے نہتے ہندوستانیوں پر گولی چلانے کا حکم دیا جس کی وجہ سے سیکڑوں ہندوستانی مقتول اور سیکڑوں گھائل ہوئے۔

۱۹۱۷ء میں روس میں زبردست انقلاب رونما ہوا اور اشتراکیت پر مبنی نظام قائم ہوا۔ جس کے اثرات ہندوستان تک بھی پہنچے۔ ۱۹۲۱ء کے کانگریس کے اجلاس میں مولانا حسرت موہانی نے مکمل آزادی کی قرارداد پیش کرنی چاہی لیکن گاندھی جی نے اس کی مخالفت کی۔ بعد کے برسوں میں کانگریس نے گاندھی جی کی رہنمائی میں ستیہ گرہ، عدمِ تعاون اور ترکِ موالات کی تحریکیں چلائیں۔ چوراچوری میں پولیس پر ہڑتالیوں کے حملے کے سبب گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک معطل کر دی حالاں کہ اس تحریک نے انگریزی سامراج کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ گاندھی جی کے اس فیصلے کو پرجوش انقلابی رہنماؤں نے پسند نہیں کیا۔ اگرچہ گاندھی جی نے تحریک واپس لے لی تھی لیکن اس کا اثر گاؤں گاؤں پھیل گیا تھا۔ چنانچہ تحریک ختم کیے جانے کے بعد مزدوروں اور کسانوں کی سبھائیں سرگرم ہو گئیں اور اپنے طور پر سیاسی مطالبات کے لیے جدّ و جہد کرنے لگیں۔ جگہ جگہ ٹریڈ یونین قائم ہو گئیں اور ہڑتالوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ خود کانگریس کے اندر بھی بائیں بازو کے خیالات رکھنے والوں کو تقویت ملتی جا رہی تھی۔

۱۹۱۷ء میں پنڈت نہرو یورپ گئے تو اشتراکی فلسفے سے متاثر ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں کانگریس کے مدراس کے اجلاس میں بائیں بازو کے حامیوں کا غلبہ تھا۔ انہوں نے مکمل آزادی کا رزولیوشن پاس کیا لیکن گاندھی جی نے پھر اس کی مخالفت کی اور کانگریس کے اجلاس کلکتہ میں نہرو رپورٹ کے ذریعہ آزادی کے مطالبہ کو ایک سال کے لیے ملتوی کر دیا۔ مزدوروں اور کسانوں کے دستوں نے اس فیصلے کی سخت مخالفت کی پچاس ہزار مزدوروں نے کلکتہ اجلاس کے دَوران مظاہرہ کیا اور ''آزاد اشتراکی ہندوستان'' کے نعرے لگائے۔ بالآخر اعتدال پسندوں کو ان کا یہ مطالبہ ماننا پڑا کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے فوراً جدوجہد شروع کی جائے اور اس میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو۔

ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد اور قومی تحریک کی وسعت اور مقبولیت نے ہندوستانی عوام کی سماجی اور تہذیبی زندگی پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ بیسویں صدی کے اردو ادب میں ہونے والی تبدیلیاں بھی جدوجہد آزادی کے اثر کو ظاہر کرتی ہیں۔ بدلے ہوئے سیاسی و قومی شعور کے سبب قدیم طرز کی شاعری اور داستان طرازی کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ اقبالؔ، چکبستؔ اور سرورؔ جہاں آبادی کی نظمیں نوجوانوں میں حب الوطنی اور آزادی کے جذبات پروان چڑھا رہی تھیں۔ قومیت کا احساس عام ہو رہا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر کا اخبار ''ہمدردی'' مولانا ظفر علی خاں کا ''زمیندار'' اور مولانا ابوالکلام آزاد کا ''الہلال'' صدیوں کے سوئے ذہنوں کو اپنی انقلابی کڑک سے بیدار کر رہے تھے۔

۱۹۰۸ء میں پریم چند کے افسانوں کا مجموعہ ''سوزِ وطن'' شائع ہوا تو انگریز حکومت نے اسے ضبط کر لیا۔ ۱۹۱۴ء میں جنگِ بلقان کے موقعہ پر لکھی گئی شبلی کی نظم بھی ضبط کر لی گئی۔ اقبال کی شاعری نوجوانوں کو خودی اور حرکت و عمل کا پیغام دے رہی تھی۔ اسی دَور میں نیاز فتح پوری اپنی تجدد پسند تحریروں کے ذریعہ عام مذہبی تصوّرات پر سوالیہ نشانات لگا رہے تھے اور نوجوانوں کو آزاد خیالی کا درس دے رہے تھے۔

ایک طرف تو سماجی اور ادبی سطح پر یہ تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور دوسری طرف مختلف ممالک میں اشتراکیت کی ترقی اور عوامی انقلاب کی لہر نے ہندوستان کی نئی بساط کو ایک نیا سیاسی شعور بخشا۔ اسی کے ساتھ خواتین کی بیداری کی تحریکات بھی شروع ہوئیں۔ تعلیمِ نسواں اور عورتوں کی آزادی کے نظریے کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ انگریزی تعلیم سے واقف طبقہ، امریکہ کی آزادی، انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس پر کتابوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ مغربی رہنماؤں کی فکر اور ان کی خدمات اس طبقے کی فکر و بصیرت کو روشنی اور جذبۂ عمل کو مہمیز دے رہی تھیں۔ مغرب میں رونما ہونے والے انقلابات اور مغربی افکار و دانش سے وہ نوجوان زیادہ متاثر تھے جو یورپ کی درسگاہوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

03.04 ترقی پسند تحریک کا آغاز

لندن میں مقیم ہندوستانی نوجوانوں نے جو آپس میں ہم خیال تھے سجاد ظہیر کے کمرے میں جمع ہونا سروع کیا۔ ان نشستوں کی حیثیت اسٹڈی سرکل کی سی تھی۔ اس حلقے میں سجاد ظہیر کے علاوہ ڈاکٹر جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا، ملک راج آنند اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر شامل تھے۔ انہوں نے سوچا کہ ہندوستانی ادیبوں کی ایک انجمن ہونی چاہیے۔ تاکہ ہندوستان کے ادیب اور شاعر ملک اور عوام کو درپیش مسائل کے بارے میں غور کر سکیں۔ کچھ دنوں کے بعد ۱۹۳۵ء میں اس انجمن کی تشکیل عمل میں آئی اور اس کا نام ''ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن'' رکھا گیا۔ ملک راج آنند اس کے صدر مقرر ہوئے۔ اس انجمن کا ایک مینی فیسٹو بھی تیار کیا گیا اور اس کا پہلا با قاعدہ اجلاس لندن کے نان کنگ ریسٹوران میں ہوا۔ ان نوجوان ترقی پسندوں نے اپنی تحریک کا جو پہلا مینی فیسٹو تیار کیا اس میں انہوں نے ہندوستانی ادیبوں کو ملک اور سماج میں وقوع پذیر بڑی تبدیلیوں کی طرف متوجہ کیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ ہندوستانی زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کو اپنے فکر و فن کا موضوع بنائیں اور

ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنا تعاون دیں۔ سجاد ظہیر اور ان کے رفقا نے لندن میں جو انجمن بنائی تھی وہ اسے ایک تحریک کی شکل دینا چاہتے تھے۔ چناں چہ انہوں نے اپنے مینی فیسٹو کی نقلیں ہندوستان میں اپنے دوستوں اور اُدبا کو روانہ کیں اور اس کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی۔ ہندوستان میں پریم چند نے سب سے پہلے اس مینی فیسٹو کی پذیرائی کی اور اسے اپنے زیرِ ادارت نکلنے والے پرچے ''ہنس'' میں شائع کر کے ایک اداریہ لکھا اور اس کے مقاصد کی تائید کرتے ہوئے اسے ادب میں ایک نئے دَور کا آغاز قرار دیا۔ ۱۹۳۵ء میں سجاد ظہیر ہندوستان آئے اور الہ آباد میں قیام کیا۔ الہ آباد میں انہوں نے اپنے ہم خیال لوگوں کا ایک حلقہ بنایا جن میں الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پنڈت اَمر ناتھ جھا، مشہور مؤرّخ ڈاکٹر تارا چند اور دو نو جوان طالب علم احتشام حسین اور سید وقار عظیم شامل تھے۔ اتفاقاً اسی زمانے میں منشی پریم چند، مولوی عبدالحق اور جوش ملیح آبادی ہندوستانی اکیڈمی کی کانفرنس میں شرکت کے لیے الہ آباد آئے ہوئے تھے۔ سجاد ظہیر نے ان سے ملاقات کی اور تحریک کے منصوبے اور مقاصد بیان کیے۔ ان حضرات نے بھی مینی فیسٹو پر دستخط کیے۔

الہ آباد میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کے قیام کے ساتھ ہی ہندوستان کے دیگر شہروں میں انجمن کی شاخیں قائم ہونے لگیں۔ چنانچہ علی سردار جعفری اور جاں نثار اختر کی کوششوں سے علی گڑھ میں، سبطِ حسن کی کوششوں سے حیدر آباد میں، فیض، محمود الظفر اور رشید جہاں کی کوشش سے لاہور میں اور سہیل عظیم آبادی اور اختر اورینوی کی مساعی سے صوبۂ بہار میں انجمن کی شاخیں قائم ہوئیں۔ بنگال میں اس تحریک کو منظّم کرنے میں ہیرن مکھرجی نے اہم حصہ لیا اور کلکتہ میں انجمن قائم کی۔ اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے ترقی پسند مصنّفین کی تحریک نے ہندوستان بھر میں مقبولیت حاصل کر لی۔ ہر طرف ترقی پسند خیالات کی گونج سنائی دینے لگی۔ یہ ہندوستان کی پہلی ادبی تحریک تھی جس میں نہ صرف اردو کے ادیب اور شاعر شریک تھے بلکہ نظریاتی اتحاد کی بنا پر دوسری زبانوں کے ادیب بھی اس میں شامل ہو رہے تھے۔ اس طرح کی صورتِ حال میں ترقی پسند مصنّفین کی ایک کل ہند کانفرنس کی ضرورت محسوس کی گئی تاکہ ملک کے ادیبوں کو ایک جگہ جمع ہونے ادب اور زندگی کے مسائل پر غور کرنے کو موقع مل سکے اور ساتھ ہی ساتھ انجمن کے تنظیمی اُمور جیسے انجمن کے دستوں کی تیاری، کل ہند مرکزی تنظیم کے قیام اور انجمن کے لائحہ عمل کی تیاری وغیرہ کو قطعیت دی جائے۔ اس کانفرنس کی صدارت کے لیے نوجوان ترقی پسند ادیبوں نے پریم چند کا نام تجویز کیا جنہوں نے ان کے اصرار پر صدارت کے لیے حامی بھر لی۔

03.05 ترقی پسند تحریک کے مقاصد

ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس اپریل ۱۹۳۶ء میں لکھنو میں ہوئی۔ اس میں پریم چند کے علاوہ حسرت موہانی، جے پرکاش نرائن، کملا دیوی چٹو پادھیائے، میاں افتخار الدین، یوسف مہر علی، اندر لال یاجنک اور جینندر کمار وغیرہ نے شرکت کی۔ ان کے علاوہ بنگال، گجرات، مہاراشٹر اور مدراس کے ترقی پسند ادیب بھی شریک ہوئے۔ کانفرنس میں انجمن کا دستور منظور کیا گیا۔ سجاد ظہیر کو انجمن کا جنرل سکریٹری چنا گیا اور صوبائی شاخوں کے کام کے اُصول طے کیے گئے۔ اس کانفرنس کی دو چیزوں کو یادگار حیثیت حاصل ہوئی ایک تو ''اعلان نامہ'' دوسرے پریم چند کا خطبۂ صدارت۔ ترقی پسند مصنّفین ادب برائے زندگی کے علم بردار تھے۔ وہ ادب کو زندگی کے مسائل کا ترجمان بنانے کے ساتھ ساتھ اس تحریک کا رشتہ ملک کی آزادی اور جمہوریت سے جوڑنا چاہتے تھے۔ ''اعلان نامے'' میں انہوں نے اپنے مقاصد کی کھل کر وضاحت کی اس ''اعلان نامہ'' کے مطابق اس تحریک کے مندرجہ ذیل مقاصد طے کیے گئے:

﴿۱﴾ تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنّفین کی امداد سے مشاورتی جلسے منعقد کرا اور لٹریچر شائع کر کے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔

﴿۲﴾ ترقی پسند مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدو جہد کر کے اہل ملک کی آزادی کی کوشش کرنا۔

﴿۳﴾ ترقی پذیر مصنّفین کی مدد کرنا۔

﴿۴﴾ آزادیِ رائے اور آزادیِ خیال کی حفاظت کی کوشش کرنا۔

پریم چند نے اپنے تاریخی خطبۂ صدارت میں اس تحریک کی رہنمائی کے لیے نہایت اہم باتیں بیان کیں، انہوں نے قدیم ادب پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ:

> ''اب وقت آ گیا ہے کہ ہمیں حُسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرور نہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ اُمرا کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا۔ انھیں کی قدر دانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انھیں کو خوشیوں اور رنجوں، حسرتوں اور تمناؤں، چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح وتفسیر آرٹ کا مقصد تھا ان کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف اُٹھتی تھیں۔ جھونپڑے اور کھنڈر اس کے التفات کے قابل نہ تھے۔''

پریم چند نے اپنے خطبے میں ترقی پسند تحریک کے اصل مقصد اور اس کے لائحۂ عمل کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ:

> ''ہمارا مدعا ملک میں ایسی فضا پیدا کرنا ہے جس میں مطلوبہ ادب پیدا ہو سکے اور نشو ونما پا سکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ادب کے مرکزوں میں ہماری انجمنیں قائم ہوں اور وہاں ادب کے رجحانات پر باقاعدہ چرچے ہوں، مضامین پڑھے جائیں، مباحثے ہوں، تنقیدیں ہوں جبھی وہ فضا تیار ہوگی، جبھی ادب کے نشاۃ ثانیہ کا ظہور ہوگا۔ ہم ہر صوبے میں ہر ایک زبان میں ایسی انجمنیں قائم کرنا چاہتے ہیں تا کہ اپنا پیغام ہر ایک زبان میں پہنچائیں۔''

پریم چند نے اپنا خطبہ ختم کرتے ہوئے آخر میں کہا:

> ''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اُترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تمیز کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔''

ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کل ہند کانفرنس نے ملک کے ادیبوں اور شاعروں کو اس تحریک کی طرف متوجہ کیا اور آنے والے برسوں کے دَوران یہ تحریک ملک گیر تحریک بن گئی۔

03.06 ترقی پسند تحریک کے اردو ادب پر اثرات

ترقی پسند تحریک نے اردو شعر وادب کو بڑی شدت سے متاثر کیا۔ اس تحریک سے وابستہ نمایاں مقام حاصل کرنے والے شاعروں میں فیضؔ، مخدومؔ، مجازؔ، جذبیؔ اور علی سردار جعفریؔ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ سلام مچھلی شہری، علی جوّاد زیدی، اختر انصاری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، مجروحؔ سلطان پوری، ساحرؔ لدھیانوی اور احمد ندیم قاسمی کا شمار بھی ترقی پسند تحریک کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ فراقؔ ترقی پسند تحریک

سے منسلک تھے لیکن ان کی شعری دنیا اُسلوب اور انداز سب سے منفرد والگ تھلگ تھا۔ وہ غزل کے شاعر تھے لیکن انہوں نے نظمیں اور رباعیات بھی لکھیں۔ ان کی سیاسی اور سماجی نظموں میں دھرتی کی کروٹ، شاہ نامہ آدم، ڈالر دیس اور امریکی بنجارہ نامہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

فیض احمد فیض ممتاز ترقی پسند شاعر تھے، نقشِ فریادی، دستِ صبا، زنداں نامہ اور سرِ وادیٔ سینا وغیرہ ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ان کی نظموں میں جمالیاتی احساس، شعری علامات کے خوب صورت استعمال کے ساتھ ساتھ فکر کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ صبحِ آزادی، دو عشق، نثار میں تیری گلیوں کے، شیشوں کا مسیحا، زنداں کی ایک شام، روشنیوں کے شہر اور دریچہ وغیرہ ان کی کامیاب نظمیں ہیں جن میں ترقی پسند تصوّرات اور جمالیات کا امتزاج ملتا ہے۔

مخدوم محی الدین بھی اس تحریک کے نمائندہ شاعر تھے انہوں نے عشقیہ رومانی اور انقلابی نظمیں لکھیں، ان کی غزلوں میں تغزّل کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ انقلاب، سپاہی، اسٹالن، چارہ گر، طور، سجدہ اور انتظار ان کی اہم نظمیں ہیں۔ معین احسن جذبی نے بحیثیتِ غزل گو مقام بنایا لیکن انھوں نے نظمیں بھی لکھیں۔ طوائف، موت، منزل تک وغیرہ ان کی خوب صورت نظمیں ہیں۔

علی سردار جعفری اقبال سے متاثر تھے، انہوں نے بلند آہنگ، سیاسی اور انقلابی نظمیں لکھی۔ سالِ نو، ٹوٹا ہوا ستارا اور آخری خط ان کی منفرد نظمیں ہیں۔ آتشیں ستارا، انقلابِ روس، عظمتِ انسان، ملاحوں کی بغاوت، سیلاب، چین، موت، زنداں بہ زنداں اور کورو وغیرہ۔ سردار جعفری کی وہ نظمیں ہیں جن میں انہوں نے انقلاب، اشتراکیت اور ترقی پسند خیالات کا اظہار کیا ہے۔

کیفی اعظمی بھی ترقی پسند تحریک کے اہم شاعر ہیں، ان کی نظموں میں بھی خطابت کا انداز ہے لیکن سردار جعفری کے مقابلہ میں کم۔ سودیت یونین اور ہندوستان، فتح برلن اور سوئے برلن جارہی ہے سرخ فوج وغیرہ ان کی وہ نظمیں ہیں جن میں اشتراکی خیالات کا راست اظہار کیا گیا ہے۔

شاعری کی طرح ترقی پسند تحریک نے اردو افسانے کو بھی متاثر کیا۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز سے قبل ہی پریم چند نے اپنے افسانوں میں دیہاتی زندگی کے معاشی اور معاشرتی پہلوؤں اور دلت مسائل کی ترجمانی کی تھی۔ پریم چند سے متاثر افسانہ نگاروں میں علی عباس حسینی اور سہیل عظیم آبادی بعد میں ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر ہوئے۔ ترقی پسند تحریک کے اہم افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، اوپیندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس اور بعد کی نسل میں قاضی عبدالستار، انور عظیم، جیلانی بانو اور اقبال متین وغیرہ اہم ہیں۔

کرشن چندر نے سب سے زیادہ افسانے اور ناول لکھے، ان کے افسانوں میں رومانیت حقیقت اور اشتراکیت کا امتزاج ملتا ہے۔ اُن کے تین طویل مختصر افسانے اور ناول، زندگی کے موڑ پر۔ گرجن کی ایک شام اور بالکونی بہت مشہور ہوئے۔ افسانہ دو فرلانگ، لمبی سڑک میں سماجی حقیقت نگاری کا رنگ نظر آتا ہے۔ اَن داتا، ہولی اور کالو بھنگی وغیرہ میں سماجی برائیوں پر گہرا طنز ہے انہوں نے اپنے افسانوں میں سماج کی تلخ حقیقتوں کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ منٹو نے ابتدا میں روسی ادیبوں کا اثر قبول کیا۔ نیا قانون، ان کا ایک انقلابی افسانہ ہے۔ منٹو نے اپنے افسانوں میں سماج کی سنگین حقیقتوں کو بڑی بے باکی سے پیش کیا ہے اس لیے اُن پر عریانی کا الزام لگایا گیا۔ بابو گوپی ناتھ، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور موذیل ان کے نہایت پر اثر افسانے ہیں۔ بیدی بھی اس دَور کے اہم افسانہ نگار ہیں جنہوں نے عام گھریلو زندگی کے مسائل

ہوتے ہیں۔انہوں نے عورتوں کے مسائل،ان کے جذبات اوران کی نفسیات کی نہایت باریک بینی سے عکاسی کی ہے۔ڈائن،ساس،جڑیں اور ننھی کی نانی وغیرہ ان کے اہم افسانے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانوں میں پنجاب کی دیہات کی زندگی کو موضوع بنایا۔ ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد ان کا شاہکار افسانہ ہے۔ان کی دوسری کہانیوں میں سناغا،ارتقا،نمک حلال،کفارہ اور کفن دفن وغیرہ اہم ہیں۔

خواجہ احمد عباس بحیثیتِ صحافی اور قلم ساز مشہور ہوئے لیکن وہ ایک افسانہ نگار بھی تھے۔ان کے افسانوں میں ابابیل،ایک پائل چاول، زنگی اور سردار جی کامیاب ہیں۔اپندر ناتھ اشک،اختر انصاری اور ابراہیم جلیس وغیرہ اس دَور کے دوسرے قابلِ ذکر ترقی پسند افسانہ نگار ہیں۔

ترقی پسند تحریک نے اردو نظم اور اردو افسانہ کو جس شدّت سے متاثر کیا تھا اس شدت سے اردو ناول کو متاثر نہیں کرسکی۔اس تحریک کے دَوران اُبھرنے والے ایک اہم ناول نگار کرشن چندر ہیں جنہوں نے کئی ناول لکھے۔''شکست'' ان کا شاہکار ناول ہے۔اس کے علاوہ جب کھیت جاگے،آسمان روشن ہے،طوفان کی کلیاں،ایک وائلن سمندر کنارے،اُلجھی لڑکی کالے بال،چاندی کے گھاؤ اور ایک عورت ہزار دیوانے وغیرہ ان کے اہم ناول ہیں۔جن میں انہوں نے کسانوں اور غریب طبقے کے مسائل کی عکاسی کی ہے۔

عصمت چغتائی اس دَور کی اہم ناول نگار ہیں،انہوں نے اپنے ناولوں میں متوسط طبقے کے مسلمان گھرانوں کی اخلاقی،معاشی اور ذہنی زندگی کی حقیقت پسندانہ ترجمانی کی ہے۔'ضدی' ان کا مشہور ناول ہے،اس کے علاوہ ٹیڑھی لکیر،معصومہ اور ایک قطرہ خون وغیرہ ان کے اہم ناول ہیں۔عزیز احمد اس دَور کے بڑے ناول نگار تھے۔جنہوں نے اپنے عہد کی زندگی کے مختلف موضوعات پر ناول لکھے۔ان کے اہم ناولوں میں گریز،ایسی بلندی ایسی پستی،آگ اور شبنم وغیرہ شامل ہیں۔ان کے ناول فنی اعتبار سے کامیاب ہوتے ہیں۔

ہندوستان کی جدوجہد آزادی کو موضوع بنا کر حیات اللہ انصاری نے ،لہو کے پھول کے نام سے ایک ضخیم ناول لکھا جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔اس کے علاوہ گھروندا بھی ان کا اہم ناول ہے۔تحریکِ آزادی کے موضوع پر خواجہ احمد عباس نے ناول 'انقلاب' لکھا۔سیاہ سورج سفید سائے بھی ان کا ایک قابلِ ذکر ناول ہے۔

تقسیم وفسادات کے موضوع پر بھی بعض ناول نگاروں نے قلم اُٹھایا۔اس سلسلہ میں راما نند ساگر کا ناول ''اور انسان مرگیا'' انسان دوستی اور ظلم سے نفرت کا پیغام دیتا ہے۔قرۃ العین حیدر کے ناول 'میرے بھی صنم خانے' میں بھی فسادات کا مختصر لیکن پر اثر ذکر ملتا ہے۔اسی موضوع پر قدرت اللہ شہاب کا 'یا خدا' فنی اعتبار سے مکمل ناول ہے۔

زمین دارانہ نظام کے خلاف قاضی عبدالستار نے اپنے ناول 'شب گزیدہ' اور انور عظیم نے 'دھواں دھواں سویرا' میں آواز اُٹھائی۔ جیلانی بانو کے ناول ایوان،غزل اور بارش سنگ میں بھی زمینداروں کے ہاتھوں غریبوں کے استحصال کی عکاسی کی گئی ہے۔

صنعتی مزدوروں کی زندگی کے مسائل پر ہنس راج رہبر نے دو ناول،پریڈ گراونڈ اور بندگلی لکھے۔اسی موضوع پر مہندر ناتھ نے بھی سورج ریت اور گناہ کے نام سے ایک ناول جو گئو دان اور اُمراؤ جان ادا کے ہم پایہ نہیں لکھا گیا۔

ترقی پسند تحریک نے اردو کے تنقیدی سرمایے میں بھی گراں قدر اضافہ کیا۔اس تحریک سے وابستہ ناقدین میں جنھوں نے نہ صرف ترقی پسند نظریات کا دِفاع یا بلکہ نظری اور عملی تنقید کے قابل قدر نمونے پیش کیے سجاد ظہیر،اختر حسین رائے پوری،احتشام حسین،آل احمد سرور، ممتاز حسین،علی سردار جعفری،مجنوں گورکھپوری اور سید عقیل رضوی وغیرہ اہم مقام رکھتے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ کانگریس میں انتہا پسندوں کے رہنما کون تھے؟

﴿۲﴾ روس میں انقلاب کب رونما ہوا؟

﴿۳﴾ پریم چند کے افسانوں کا کون سا مجموعہ ضبط ہوا؟

﴿۴﴾ سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں نے لندن میں جو انجمن بنائی اس کا کیا نام تھا ؟

﴿۵﴾ ہندوستان میں سب سے پہلے کس ادیب نے ترقی پسند تحریک کے مینی فیسٹو کی تائید کی؟

﴿۶﴾ ہندوستان میں ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس کب ہوئی؟

03.07 خلاصہ

۱۹۳۵ء میں لندن میں زیر تعلیم ہندوستانی نوجوانوں کے ایک گروہ نے انڈین پروگریسیو رائٹرز ایسوسی ایشن بنائی۔ یہ نوجوان سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا اور دین محمد تاثیر تھے۔ انہوں نے ادیبوں اور شاعروں کے لیے ایک مینی فیسٹو بنایا اور اپنے دوستوں کے پاس ہندوستان روانہ کیا۔ پریم چند نے اپنے رسالے ہنس میں یہ مینی فیسٹو شائع کیا۔ اسی سال سجاد ظہیر ہندوستان لوٹے تو انہوں نے ترقی پسندوں کا ایک حلقہ بنا لیا۔ ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس اپریل ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں پریم چند نے یادگار خطبہ دیا۔ اس کانفرنس میں ترقی پسند مصنّفین کا منشور جاری کیا گیا جس میں تلقین کی گئی کہ کھوکھلی تصوّر پرستی اور رومانیت کو چھوڑ کر عقلیت اختیار کریں۔ پریم چند نے اپنے خطبے میں کہا کہ ہمیں حُسن کا معیار بدلنا ہوگا اور ایسا ادب تخلیق کرنا ہوگا جو آزادی، غربت اور دوسرے سماجی مسائل کی ترجمانی کرتا ہو۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین کی شاخیں ہندوستان کے کئی شہروں میں قائم ہوئیں۔

ترقی پسند تحریک نے اردو زبان و ادب کو گہرائی سے متاثر کیا۔ ترقی پسند شاعروں میں مجاز، فیض، مخدوم، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، جذبی اور علی سردار جعفری نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی اہم ہیں۔ ان کے علاوہ اُپندر ناتھ اشک، خواجہ احمد عباس اور مہندر ناتھ وغیرہ بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔ ناول نگاروں میں سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، عزیز احمد اور حیات اللہ انصاری وغیرہ نے ترقی پسند ناول لکھے۔ تنقید میں سجاد ظہیر، اختر حسین رائے پوری، احتشام حسین مجنوں گورکھپوری، آل احمد سُرور اور ممتاز حسین نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

03.08 فرہنگ

آزاد خیالی	:	بے راہ روی
استحصال	:	حاصل کرنا، ظلم و زیادتی کرنا
اظہارِ خیال	:	اپنے خیالات کو ظاہر کرنا
التفات	:	توجہ، کسی خاص شخص یا چیز کی جانب خیال کا جھکاؤ
طلسم	:	نظر بندی، شعبدہ گری، حیرت میں ڈالنے والا منظر
عریانی	:	فحش نگاری، تحریر میں جنسی اظہار کا کھلا اظہار و بیان، برہنگی، ننگا پن
قدردانی	:	احترام، وقعت، عزت افزائی

انتہا پسند : حدود تجاوز کرنے والا
اوّلین : پہلی، پہلا، سب سے مقدم
باریک بینی : نکتہ شناسی، معاملے کے نازک پہلو پر غور کرنا
برملا : ظاہر
تائید : مدد، امداد، طرف داری
تبلیغ : پہنچانا، ابلاغ
تقسیم : بٹوارہ
تعلیمِ نسواں : خواتین کی تعلیم
تقویت : قوت دینا یا پہنچنا
توانائی : طاقت، زور، بَل
حامیوں : حامی کی جمع، حمایتی، طرف دار
دفاع : حفاظت، بچاؤ، روکنے دُور کرنے یا ہٹانے کا عمل یا کیفیت
رجحان : طبیعت یا ذہن وغیرہ کا قدرتی یا فطرتی جھکاؤ اور رغبت، توجہ، میلان
ردِعمل : کسی عمل کا اثر یا نتیجہ، جوابی ردِعمل
رقابت : دشمنی، رنجش
سامراج : ملوکیت کا نظام، شہنشائیت کی حاکمیت
شدت پسند : سختی کرنے والا ہونا
ضبط : تحمل، برداشت، صبر
قدیم طرز : پرانی روش، پرانا طریقہ، پرانا اسلوب
کسوٹی : محک، جانچ یا پرکھ کا معیار
متوسط طبقے : مڈل کلاس
مدعا : مقصود، غرض، مطلب، مقصد
مظاہرہ : کسی خاص امر کی تائید یا اس سے اختلاف ظاہر کرنے کے لیے مجمع کر کے گشت کرنا۔
مقتول : قتل کیا جانا
ملتوی : آئندہ کے لیے ٹالا یا اُٹھا رکھا ہوا، التوا میں ڈالا ہوا
ملک گیر : تمام ملک میں پھیلا یا چھایا ہوا
مینوفیسٹو : وہ بنیادی تحریر جس میں کسی جماعت وغیرہ کے اصول و مقاصد درج ہوں، اعلامِ محضر
نشاۃ ثانیہ : نئی زندگی، حیاتِ نَو
نشان دہی : کسی چیز کی جانب توجہ دلانا، زبانی یا تحریری اشارہ کرنا، محلِ وقوع بتانا
نشوونما : بالیدگی، ترقی، عروج، ارتقا
نقّاد : ناقد کی جمع، تنقید کرنے والے، جانچ پرکھ کرنے والے
نہتّے : خالی ہاتھ لوگ
ہم پایہ : ہم مرتبہ

03.09 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : ترقی پسند تحریک کا پس منظر مختصراً بیان کیجیے؟

سوال نمبر۲ : ترقی پسند تحریک کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

سوال نمبر۳ : اردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کی نشان دہی کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : ترقی پسند تحریک کے مقاصد پر ایک مضمون لکھیے۔

سوال نمبر۲ : ترقی پسند تحریک کے آغاز سے متعلق اپنا موقف واضح کیجیے؟

سوال نمبر۳ : پریم چند کے خطبۂ صدارت کے اہم نکات سپرد قرطاس کیجیے۔

03.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔	ادبی تحریکیں	از	انور سدید
۲۔	اُردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	از	منظر اعظمی
۳۔	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	از	خلیل الرحمٰن اعظمی
۴۔	جدیدیت، تجزیہ و تفہیم	از	مظفر حنفی

03.11 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ بال گنگا دھر تلک

﴿۲﴾ ۱۹۱۷ء

﴿۳﴾ سوز وطن

﴿۴﴾ ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن

﴿۵﴾ پریم چند

﴿۶﴾ اپریل ۱۹۳۶ء

اکائی 04 حلقۂ اربابِ ذوق

ساخت

04.01 : اغراض و مقاصد
04.02 : تمہید
04.03 : حلقۂ اربابِ ذوق کا مختصر تعارف
04.04 : حلقۂ اربابِ ذوق کے مقاصد
04.05 : حلقۂ اربابِ ذوق کے اردو زبان وادب پر اثرات
04.06 : خلاصہ
04.07 : فرہنگ
04.08 : نمونہ امتحانی سوالات
04.09 : حوالہ جاتی کتب
04.10 : اپنے مطالعے کے جانچ کے جوابات

04.01 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں آپ مندرجہ ذیل موضوع کا مطالعہ حاصل کریں گے:

اس اکائی کی مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ اردو ادب کی تحریکوں میں سے ایک اہم تحریک ''حلقۂ اربابِ ذوق'' سے روبرو ہوسکیں۔ اردو ادب میں حلقۂ اربابِ ذوق کے اہم رجحان پر روشنی ڈال سکیں۔ اسی تحریک کے رجحان کا پس منظر بیان کرسکیں۔ اس تحریک ادبی رجحان کے مقاصد و مدعا پر اظہار خیال کرسکیں۔ اردو ادب پر اس تحریک اور رجحان کے اثر کی نشان دہی کرسکیں۔

04.02 تمہید

ترقی پسند تحریک نے اجتماعی فکر اور اجتماعی مسائل پر زور دیا۔ اس نے انفرادی افکار اور انفرادی تجربات کو غیر صحت مند اور انحطاطی رجحان قرار دیا۔ ترقی پسندوں کے اس رویے کے خلاف ان شعرا نے جو ادب میں انفرادیت، نئے طرزِ احساس، داخلی تپش، نئے استعاروں اور نئے تجربات کے قائل تھے۔ اپنی ایک جماعت بنائی جو بعد میں ''حلقۂ اربابِ ذوق'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

04.03 حلقۂ اربابِ ذوق کا مختصر تعارف

حلقۂ اربابِ ذوق کی تحریک، ترقی پسند تحریک کے تقریباً ساتھ ساتھ ہی شروع ہوئی اور اس کے متوازی سفر کرتی رہی۔ ترقی پسند تحریک منصوبہ بند انداز میں شروع ہوئی اس کے برعکس حلقۂ اربابِ ذوق کی ٹھیک خودرَو پودے کی طرح اُگی اور دھیرے دھیرے ایک گھنے

پیڑ کی شکل اختیار کر گئی۔ اس کا آغاز ۲۹ اپریل ۱۹۳۹ء کو ہوا جب سید نصیر الدین جامعی نے اپنے چند دوستوں کو جن میں نسیم حجازی، تابش صدیقی، محمد سعید، عبدالغنی اور شیر محمد اختر وغیرہ شامل تھے جمع کیا اور ایک ادبی محفل منعقد کی۔ اس محفل میں نسیم حجازی نے اپنا ایک افسانہ پیش کیا۔ شرکا نے اس افسانے پر گفتگو کی، اسی محفل میں ادبی نشست کے اس سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے ایک مجلس قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا اور رسمی طور پر اس کا نام ''مجلس داستانِ گویاں'' رکھا گیا۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ ہر ہفتہ اس کا اجلاس منعقد ہوگا جس میں افسانے پڑھے جائیں گے اور ان پر جدید مغربی تنقید کی روشنی میں بحث ہوگی۔

04.04 حلقۂ اربابِ ذوق کے مقاصد

''مجلس داستانِ گویاں'' کا اجلاس ہر ہفتہ ایک رکن کے مکان پر ہوتا جس میں افسانے پڑھے جاتے۔ تنقیدیں ہوتیں اور آخر میں شعرا اپنا کلام سناتے۔ بعد میں جب مجلس میں پڑھی جانے والی نظموں پر رائے زنی ہونے لگی تو مجلسِ داستان گویاں کا نام بدل کر حلقۂ اربابِ ذوق کر دیا گیا۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے مندرجہ ذیل مقاصد طے کئے گئے:

﴿۱﴾ اردو زبان کی ترویج و اشاعت۔

﴿۲﴾ نوجوان لکھنے والوں کی تعلیم و تربیت۔

﴿۳﴾ اردو لکھنے والوں کے حقوق کی حفاظت۔

﴿۴﴾ تنقید و ادب میں خلوص اور بے تکلفی پیدا کرنا۔

﴿۵﴾ اردو ادب و صحافت کے ناسازگار ماحول کو صاف کرنا۔

ابتدائی دَور میں حلقۂ اربابِ ذوق کی حیثیت ایک مقامی تنظیم کی سی تھی لیکن میرا جی کی شمولیت کے بعد حلقے میں نئی جان آ گئی۔ اس کی سرکردگی میں حلقے نے ایک ایسی تحریک کی شکل اختیار کر لی جس کا مقصد ترقی پسند تحریک کے نظریۂ ادب کی مخالفت کرنا اور ادب کی موجودہ حالت کو بدلتے ہوئے فن کے داخلی حسن کو اُجاگر کرنا تھا۔

ادب کے متعلق حلقۂ اربابِ ذوق کا نظریہ یہ تھا کہ ادب زندگی سے گہرا تاثر قبول کرتا ہے لیکن یہ کسی خاص ایجنڈے کے حصول کے لیے تبلیغ کا فریضہ سرانجام نہیں دیتا۔ ادب اپنا مقصد آپ ہے۔ اس کی اپنی جمالیاتی قدریں ہیں اور ادب ان قدروں کی پابندی کرتے ہوئے زندگی کے حُسن کو اُجاگر کرتا ہے۔ چنانچہ حلقۂ اربابِ ذوق نے زندگی کی ان اقدار پر زور دیا جن کی صداقت دوامی ہے۔ حلقۂ اربابِ ذوق نے ادیب کی تخلیقی آزادی کو اہمیت دی اور اس پر کوئی پابندی عائد کرنے کے بجائے اس کے سماجی شعور پر اعتماد کیا اور اسے کھلی آزادی دی کہ وہ زندگی کی مجموعی صورتِ حال کا بہ غور مشاہدہ کرے اور ذہنی، سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کو ادب میں بالواسطہ طور پر پیش کرے۔

حلقۂ اربابِ ذوق کی تحریک خالص ادب کی تحریک تھی۔ اس نے جذبے، خیال اور احساس کی ترجمانی کو بنیادی اہمیت دی اور تخلیق میں فن کے لوازم کی پابندی کو ضروری قرار دیا۔ حلقۂ اربابِ ذوق اور ترقی پسند تحریک کے نظریاتی ٹکراؤ کے نتیجے میں جس بحث نے سب سے زیادہ اہمیت حاصل کی وہ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث تھی۔ اس بڑے مسئلے کے ساتھ جن ضمنی مسائل نے سر اُٹھایا ان میں ''ادب اور جمالیات''، ''اظہار یا ابلاغ''، ''جذبہ اور خیال کی اہمیت''، ''ادب اور صحافت''، ''ادب اور پروپیگنڈہ''، ''شاعری میں ابہام کا

مسئلہ'' اور'' جدید شاعری اور نفسیات'' وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تمام مسائل نظریاتی نوعیت کے ہیں اور ان میں اکثر کا نشانہ ترقی پسند تحریک تھی۔ ان مباحث کے ذریعہ حلقۂ ارباب ذوق نے تنقید کے جدید اُصولوں کی توضیح واشاعت کی اور اس طرح ایک نئے تنقیدی شعور کی تشکیل میں اہم حصہ لیا۔

حلقۂ اربابِ ذوق نے نفسیات کے نو دریافت علم سے بھی پورا فائدہ اُٹھایا اور مغربی ادبیات اور دیگر فنون میں واقع ہونے والی مختلف تحریکوں کے اثرات قبول کر کے اردو ادب میں تنوّع، تازگی، توانائی اور رعنائی پیدا کی۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جو شاعری تخلیق کی گئی وہ مجموعی طور پر خطابت، جوش بیان، راست اظہار، تکرارِ الفاظ، اجتماعیت کی گونج اور خارجیت کی گھن گرج پر مشتمل تھی جس کے موضوعات ومقاصد متعین تھے۔ اس کے برخلاف حلقۂ اربابِ ذوق نے دھیمے لب ولہجے، سرگوشی کے انداز، علامتی اور مزیہ اسلوب، ابہام، جماعتی پابندیوں سے آزادی، انفرادیت پسندی اور سیاسی ومعاشی نظریات سے کنارہ کشی پر زور دیا۔ حلقے کے شاعروں اور ادیبوں نے موضوعات کے اعادہ اور تکرار کے بجائے نئے نئے تجربات اور نئے نئے موضوعات جو ترجیح دی۔

ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں حلقۂ اربابِ ذوق کی تحریک دَبی دَبی سی رہی لیکن آزادی کے بعد آہستہ آہستہ اس کا دائرہ اَثر پھیلتا گیا۔ لاہور کے علاوہ دہلی میں بھی اس کی ایک شاخ قائم ہوئی۔ تقسیمِ ہند کے بعد کراچی، ڈھاکہ، راولپنڈی کے علاوہ گجرات، لندن اور نیویارک میں بھی اس کی شاخیں قائم کی گئیں۔ حلقۂ اربابِ ذوق کی نظریات اور اس کے ادیبوں کی تخلیقات کی تشہیر کا سب سے اہم وسیلہ وہ ہفتہ وار جلسے تھے جو پابندی سے منعقد ہوئے تھے۔ ان جلسوں میں ادیب اور شاعر اپنی نئی تخلیقات پیش کرتے اور دیگر اُدبا فی البدیہ اس پر تنقید کرتے اور تخلیق کی خوبیوں اور خامیوں کو بے لاگ انداز میں بیان کر دیتے۔ حلقۂ اربابِ ذوق کی مجلسی تنقید آہستہ آہستہ مقبول ہوتی گئی۔ ان جلسوں کی وجہ سے حلقۂ اربابِ ذوق کو فروغ بھی حاصل ہوا۔

۱۹۱۴ء سے حلقۂ اربابِ ذوق نے سال بھر کی منتخب نظموں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ نظموں کے انتخاب میں مکمل غیر جانب داری برتی جاتی۔ اس کے ردِّعمل میں بعض دوسرے اداروں نے بھی شاعری کے انتخابات شائع کیے لیکن انہیں وہ مقام نہیں مل سکا جو حلقۂ اربابِ ذوق کے منتخب مجموعوں کو حاصل ہوا۔ بہترین نظموں کی اشاعت کا یہ سلسلہ مالی مشکلات کی وجہ سے بند کرنا پڑا۔ کچھ عرصہ بعد حلقے کی جانب سے ایک ادبی رسالے''نئی تحریریں'' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس رسالے میں دوسری زبانوں کے اہم نظریاتی مضامین کے تراجم شائع ہوئے لیکن مالی کی کمی کے باعث یہ رسالہ بھی زیادہ نہیں چل سکا۔

04.05 حلقۂ اربابِ ذوق کے اردو زبان وادب پر اثرات

حلقۂ اربابِ ذوق نے اردو شاعری پر گہرا اثر چھوڑا خصوصاً نئی نظم کو فروغ دینے میں حلقے کے شعرا نے قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔ حلقے سے وابستہ شعرا نے نظم میں کئی اہم فنی تجربے کیے۔ انہوں نے آزاد نظم کی ہیئت کو مقبول بنایا اور نظم کو تخلیقی زرخیزی اور جامعیت عطا کی۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے سب سے اہم اور خاص شاعر میرا جی ہیں ان کا پورا نام ثناء اللہ ڈار ہے۔ انہوں نے نظم معریٰ، آزاد نظم اور گیت کے ساتھ ساتھ صنف غزل میں بھی بحسنِ خوبی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے فکر وخیالات پر فرائڈ کے نظریات اور ہندو فلسفے کا گہرا اثر تھا ان کی نظموں میں جنسی میلانات اور دیو مالائی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

حلقے سے وابستہ شعرا میں ن.م.راشد ایک رجحان ساز شاعر تھے۔انہوں نے اردو میں آزاد نظم کی داغ بیل بھی ڈالی اور اسے پروان بھی چڑھایا۔ نئے عہد کے انسان کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو انہوں نے بڑی خوبی سے اپنی نظموں میں سمویا ہے۔ان کی نظموں میں حُسن پرستی، عشق و محبت پہلوؤں کے ساتھ معاشرتی اور تہذیبی تصوّرات کی ترجمانی بھی ملتی ہے۔

ن.م.راشد کے معاصرین میں ڈاکٹر تصدق حسین خالد اوّلین آزاد نظم لکھنے والوں میں ہیں انہوں نے مغرب کی پیکر تراشی اور علامت نگاری کا اثر قبول کیا اور اردو میں اس کے تجربے کیے۔ ان کی نظمیں روانی و تسلسل اور اختصار و محاکاتی انداز کی وجہ سے انفرادیت کی حامل ہیں۔

یوسف ظفر حلقۂ اربابِ ذوق کے اہم شاعر ہیں۔ان کی نظموں میں اپنے ملک کی تہذیب و ثقافت سے گہری ذہنی و جذباتی وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔ قیوم نظر اور ضیا جالندھری بھی حلقے سے وابستہ اوّلین شعرا میں سے ہیں۔

حلقۂ اربابِ ذوق نے اردو افسانے کو بھی متاثر کیا۔ حلقے کے افسانہ نگاروں نے نفسیات کے علم سے فائدہ اُٹھایا اور ان غیر مرئی جذبات کو افسانے میں شامل کیا جن سے فطرت کی رنگا رنگی کا کوئی زاویہ سامنے آتا ہے۔حلقۂ اربابِ ذوق کے اوّلین افسانہ نگاروں میں شیر محمد اختر، کرشن چند، اُپندر ناتھ اشک اور راجندر سنگھ بیدی شامل ہیں لیکن ان میں شیر محمد اختر کے سوا باقی سب ترقی پسند تحریک سے جڑ گئے۔ بعد کے دَور میں حلقے سے اہم افسانہ نگار اُبھرے جیسے ممتاز مفتی، محمد حسن عسکری، منٹو، انتظار حسین اور انور سجاد وغیرہ۔

حلقۂ اربابِ ذوق نے اردو تنقید پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ حلقے کی تنقید نے تخلیق کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں پر زور دیا۔اس نے ''ادب برائے ادب'' کے نظریہ کو پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ حلقے سے وابستہ تنقید نگاروں میں اوّلیت میراجی کو حاصل ہے۔جن کی دو کتابیں ''اس نظم میں'' اور ''مشرق و مغرب کے نغمے'' علمی تنقید کا اچھا نمونہ ہیں۔

حلقے سے وابستہ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی تنقیدی تحریروں میں آزادیِ فکر، آزادیِ اظہار اور جرات و بے باکی کو فروغ دیا۔ ریاض احمد نے علم نفسیات کے حوالے سے ادب پاروں کا تجزیہ کیا۔محمد حسن عسکری اردو کے بڑے نقاد تھے۔انہوں نے فن برائے فن کی برملا حمایت کی اور ایسے مضامین لکھے جن سے نئے نئے نظریاتی مباحث پیدا ہوئے۔ڈاکٹر وزیر آغا اور جیلانی کامران بھی حلقے سے وابستہ بڑے نقاد ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ حلقۂ اربابِ ذوق کا پہلا نام کیا تھا؟

﴿۲﴾ حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام کس شہر میں وقوع پذیر ہوا؟

﴿۳﴾ حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام کب عمل میں آیا؟

﴿۴﴾ حلقۂ اربابِ ذوق کے اصل فکری رہنما کون تھے؟

﴿۵﴾ ادب برائے ادب کے نظریے کو کس نے پروان چڑھایا؟

﴿۶﴾ حلقۂ اربابِ ذوق کی پہلی ادبی محفل میں کس شخصیت نے اپنا افسانہ پیش کیا۔

﴿۷﴾ حلقۂ اربابِ ذوق کے رجحان ساز شاعر کون ہیں؟

04.06 خلاصہ

حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام ۲۹؍اپریل ۱۹۳۹ء کو لاہور میں عمل میں آیا۔ ترقی پسند تحریک کے مقابلے میں اس کے اثرات دھیرے دھیرے پھیلتے گئے۔ حلقے کے زیر اہتمام ہفتہ وار ادبی محفلیں منعقد ہوئی تھیں جن میں افسانے، نظمیں اور غزلیں پیش کی جاتی تھیں۔ ان تخلیقات پر حلقے کے ارکان اور شرکائے مجلس بحث ومباحثہ کرتے تھے۔ اس طرح حلقے کی وجہ سے مجلسی تنقید کو فروغ حاصل ہوا۔ میراجی حلقۂ اربابِ ذوق کے پالیسی ساز مفکر اور رہنما تھے انھوں نے حلقے کو ایک واضح سمت دی جو ترقی پسند تحریک سے مختلف تھی۔

حلقۂ اربابِ ذوق نے ادب میں ہیئت اور داخلیت پر زور دیا اور انفرادی تجربات کو اہمیت دی۔ میراجی کے توسط سے مغربی تصوّرات، مثلاً سرئیلزم، آزاد تلازمہ، تحلیلِ نفسی، تحت الشعور اور لاشعور کے رجحانات اور وجودیت وغیرہ اردو شعر وادب میں داخل ہوئے۔ حلقۂ ارباب ذوق نے علامت نگاری، تاثریت، نئے استعارات اور پیکر تراشی پر زور دیا۔ حلقۂ ارباب ذوق نے ''ادب برائے ادب'' کی وکالت کی۔ حلقۂ ارباب ذوق سے تعلق رکھنے والے شعرا میں میراجی، ن.م. راشد، تصدق حسین خالد، قیوم نظر، یوسف ظفر، مختار صدیقی اور مجید امجد وغیرہ شامل ہیں۔ نقادوں میں میراجی، ڈاکٹر وحید قریشی، ریاض احمد، محمد حسن عسکری، وزیر آغا اور جیلانی کامران اہم وخاص ہیں۔

04.07 فرہنگ

اُجاگر	: نمایاں	رنگارنگی	: رنگ برنگی
اجتماعیت	: ایک جگہ اکٹھا ہونا، ایک نظریہ جس کی رو سے ملکیت انفرادی نہیں اجتماعی ہونی چاہئے	رہنما	: رہبر، راستہ دکھانے والا
		زرخیزی	: سرسبزی، شادابی، خوب صورتی
اجتماعی مسائل	: معاشرے یا سماج کے مسائل	سرکردگی	: قیادت، سرداری، سربراہی، رہنمائی
اختصار	: اجمال، مختصر، نسبتاً کم الفاظ میں مطلب کی ادائی	شمولیت	: شراکت، اشتراک، داخلہ
اشاعت	: نشر، کسی اخبار یا کتاب وغیرہ چھپنے کے بعد منظرِ عام پر لائے جانے کا عمل	صداقت	: سچائی، حقیقت، سچ
		ضمنی	: عارضی، فروعی
انحطاطی	: تنزل یا پستی کی جانب مائل ہونا	غیر جانب داری	: کسی کی پاس داری نہ کرنا، کسی کا ساتھ نہ دینا
اولیت	: تقدم، ترجیح، دوسرے سے اول یا مقدم ہونا	غیر مرئی	: جو آنکھوں سے دیکھنے میں نہ آسکے، نظریاتی، فکری
برعکس	: الٹا، خلاف		
پیکر تراشی	: الفاظ میں کسی جسم کی تفصیل بیان کرنے کا عمل	فروع	: اصل سے متعلق اُمور، مبادیات
تنظیم	: منظّم جماعت، جمعیت، کسی گروہ یا جماعت کا نظم، نظام	فی البدیہ	: بے سوچے سمجھے، فوراً، برمحل، بغیر توقف
		مباحث	: مبحث کی جمع، بحث طلب امور ونکات، بحثیں
تنوع	: قسم قسم، بوقلمونی	متوازی	: برابر برابر، ساتھ ساتھ چلنے والا، مطابقت رکھنے والا
توضیح	: وضاحت، صراحت کے ساتھ بیان کرنا		

جان آ جانا	: کسی شے کا دوبارہ عود کر آنا	محاکاتی	: لفظی تصویر کشی سے متعلق
خودرَو پودے	: قدرتی طور پر اُگنے والا/والی	مفکر	: قوت فکر سے کام لینے والا، بہت غور و فکر کرنے والا
داغ بیل ڈالنا	: بنیاد رکھنا، اِبتدا کرنا، پہل کرنا		
دوامی	: مستقل، پائدار، ہمیشہ کے لیے	ناسازگار	: ناموافق، جو سازگار نہ ہو
دیولائی	: قدیم روایات واساطیر پر مبنی قصے اور واقعات	وابستہ	: منسلک، جڑے ہوئے، بندھے ہوئے، متعلق
رسمی طور	: معمولی طریقے سے	ہفتہ وار	: ہر ہفتے

04.08 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : حلقۂ اربابِ ذوق کا پس منظر مختصراً رقم کیجیے؟

سوال نمبر۲ : اردو ادب پر حلقۂ اربابِ ذوق کے اثرات کی نشان دہی کیجیے۔

سوال نمبر۳ : حلقۂ اربابِ ذوق میں کون سے شاعر خاص اہمیت کے حامل ہیں؟ بتائیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : حلقۂ اربابِ ذوق کے مقاصد بیان کیجیے۔

سوال نمبر۲ : حلقۂ اربابِ ذوق سے متعلق ایک جامع مضمون تحریر کیجیے؟

سوال نمبر۳ : حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ سپردِ قرطاس کیجیے۔

04.09 حوالہ جاتی کتب

۱۔ ادبی تحریکیں از انور سدید

۲۔ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ از منظر اعظمی

۳۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک از خلیل الرحمٰن اعظمی

۴۔ جدیدیت، تجزیہ و تفہیم از مظفر حنفی

04.10 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ ''مجلس داستانِ گویاں''

﴿۲﴾ لاہور

﴿۳﴾ ۲۹/اپریل ۱۹۳۹ء

﴿۴﴾ میراجی

﴿۵﴾ حلقۂ اربابِ ذوق

﴿۶﴾ نسیم حجازی نے

﴿۷﴾ ن.م.راشد

✵

اکائی 05 جدید اُردو نثر

ساخت

05.01 : اغراض ومقاصد
05.02 : تمہید
05.03 : جدید اردو نثر کا پس منظر
05.04 : جدید اردو نثر کا ارتقا
05.05 : جدید اردو نثر کی اصناف
05.06 : خلاصہ
05.07 : فرہنگ
05.08 : نمونہ امتحانی سوالات
05.09 : حوالہ جاتی کتب
05.10 : اپنے مطالعے کے جانچ کے جوابات

05.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ درج ذیل اہم نکات کا مطالعہ کریں گے:

﴿۱﴾ جدید اردو نثر کا پس منظر ﴿۲﴾ جدید اردو نثر کا ارتقا ﴿۳﴾ جدید اردو نثر کی اصناف

05.02 تمہید

اُردو نثر کے متعلق یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ اس کا آغاز سرزمینِ دکن میں ہوا تھا۔خطۂ دکن ذی مرتبت علما وصوفیائے کرام کا مسکن رہا ہے۔جنھوں نے دینِ متین کی ترویج واشاعت کے لیے دکنی زبان کو وسیلہ بنایا۔

جس طرح انگریزی ادب میں شاعری کی نشو ونما نثر سے پہلے ہوئی ٹھیک اسی طرح اردو ادب میں بھی شاعری نثر سے پہلے معرضِ وجود میں آئی۔ہماری اردو زبان بھی شاعری سے شروع ہو کر پروان چڑھی۔

05.03 جدید اردو نثر کا پس منظر

خطۂ دکن میں اردو کی نشو ونما کا ابتدائی سہرا حضرت بندہ نواز گیسو دراز کے مشہور تذکرہ معراج العاشقین کے سر باندھا جاتا ہے۔رسالہ معراج العاشقین کا موضوع خالصتاً علمِ تصوّف ہے۔اس کتاب میں تقویٰ وطہارت ،شریعت وطریقت اور اخلاقیات کے دقیق مسائل سے بحث کی گئی ہے۔بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بندہ نواز کی چھوٹی بڑی کل سو(۱۰۰) کتابیں بتائی ہیں لیکن محققین کے نزدیک یہ تحقیق طلب

موضوع ہے۔تصوّف کی بعض مشہور کتابیں مثلاً فصوص الحکم، رسالہ قشیریہ، عوارف المعارف اور قوت القلوب وغیرہ پر حاشیہ نگاری کی خدمات انجام دیں۔حضرت بندہ نواز کے رسالے معراج العاشقین کا موضوع تصوّف و اخلاق ہے۔اس کا اندازِ نگارش بیانیہ قسم کا ہے۔جس طرح کوئی مدرس اپنے شاگردوں کو درس گاہ میں کسی اہم موضوع پر درس دیتا ہے وہی طریق کار اِس میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔اس میں تصوّف کے اہم ترین نکات سے مدلل بحث فرمائی ہے۔اس میں وجود کی درج ذیل اقسام شمار کروائی گئی ہیں۔

﴿۱﴾ واجب الوجود　﴿۲﴾ ممکن الوجود　﴿۳﴾ ممتنع الوجود

﴿۴﴾ عارف الوجود　﴿۵﴾ واجد الوجود

اس کی زبان قدیم وگنجلک ہے جسے پڑھنے اور سمجھنے میں کافی دشواری ہوتی ہے۔اس کتاب کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے۔

''قال نبی علیہ السلام کہے انسان کے بوجنے کو پانچہ تن ہر ایک تن کو پانچ دروازے میں ہور پانچ دربان ہیں۔ پہلا تن واجب الوجود، مقام اس کا شیطان نفس اس کا امارہ یعنی واجب کے آنک سوں غیر نہ دیکھا سو۔''

(ص:۱۹)

اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ معراج العاشقین بندہ نواز کی تصنیف ہے یا پھر بعد میں ان کے متعلقین و مریدین نے فرمودہ پند و نصائح کو جمع کر کے کتاب کو ترتیب دے دیا۔حالاں کہ چکی نامہ کے بعد سے اس کی گنجائش قدرِ کم ہوگئی ہے۔ممکن ہے معراج العاشقین سے قبل بندہ نواز کے سامنے بطور حوالہ کوئی کتاب موجود رہی ہو حالاں کہ......یہ بھی تحقیق طلب ہے۔

حضرت بندہ نواز کے بعد دیگر صوفیائے کرام جیسے برہان الدین جانم، میراں جی شمس العشاق ہیں جیسے بزرگوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔جانم نے زیادہ تر مذہبی اور پند و نصائح پر مبنی تحریرات لکھی ہیں۔شاہ برہان الدین جانم کا تعلق دبستانِ بیجاپور سے تھا۔آپ کا شمار روایتِ بیجاپور کے اوّل ترین شعرا میں ہوتا ہے۔جانم مشہور صوفی بزرگ میراں جی شمس العشاق کے فرزندار جمند تھے۔میراں جی کی وفات کے بعد رُشد و ہدایت کی ذمہ داری جانم نے سنبھالی۔جانم نے مریدین و سالکین کی رہنمائی کے لیے دکنی میں کئی مثنویاں تحریر کیں جیسے حجت البقا، بشارت الذکر، منفعت الایمان، سکھ سہلا، ارشاد نامہ، وصیت الہادی وغیرہ۔ارشاد نامہ جانم کی سب سے مشہور و معروف مثنوی ہے۔اس میں مرید و مرشد کے سوال و جواب کے انداز میں طریقت کے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔اس کی اِبتدا ربّ قدیر کی حمد و ثنا سے ہوتی ہے۔اس کے بعد نعتِ رسول بارگاہِ رسولِ اکرم میں پیش کی گئی ہے۔اردو کے ابتدائی زمانے میں دست یاب ہونے والے بعض نثری سرمایے ادبی معیار پر پورے نہیں اُترتے ہیں البتہ رہنمائی ضرور کرتے ہیں۔دکن کے مشہور شاعر مُلّا وجہی نے سب رَس لکھ کر ادبی نثر کے نمونے پیش کیے ہیں۔مُلّا وجہی عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔قطب شاہی بادشاہوں نے علم و ادب میں حد درجہ ذوق مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے دکنی زبان کو بے انتہا فروغ حاصل ہوا۔سب رَس کو اردو کی سب سے پہلی کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے۔جسے ۱۰۴۵ھ مطابق ۱۶۳۵ء میں گولکنڈہ کے بادشاہ عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔اس میں حُسن و عشق کے دل چسپ معرکہ کو تمثیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

سب رَس کی اہمیت لسانی وادبی دونوں لحاظ سے مشترک ہے۔اس میں ساڑھے تین سو برس قبل دکن میں بولی جانے والی بولی کا استعمال کیا گیا ہے۔اس کی عبارت خوانی اور عبارت فہمی دونوں بے حد مشکل ہے۔اردو کے موجودہ رُوپ سے کافی مختلف زبان و بولی کا استعمال کیا گیا ہے۔اس میں مقفّٰی و مسجع عبارت آرائی کا خاصا اہتمام کیا گیا ہے۔جملوں کی ساخت اگر چہ چھوٹی ہے لیکن معنی کے لحاظ سے بہت وسیع ہے۔

فضل علی المتخلص بہ فضلی شمالی ہندوستان کا عظیم شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔فضلی کی کربل کتھا شمالی ہندوستان کی پہلی نثری کتاب ہے جو ۱۷۳۱ء کو پائے تکمیل کو پہنچی۔کربل کتھا کا موجودہ نسخہ ذخیرۂ اسپنگر سے حاصل ہوا ہے۔یہ نادر ونایاب نسخہ دوسری جنگ عظیم کے دَوران برلن سے ٹیوب گن چلا گیا تھا۔جسے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے دست یاب کیا تھا۔یہ کتاب دراصل روضۃ الشہد اکا اردو ترجمہ ہے۔جوانوار سہیلی کے مصنف مُلاّ حسین بن علی الواعظ الکاشفی کی مشہور کتاب ہے جسے محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں تصنیف کیا گیا تھا۔اس میں کربلا کے واقعات دل گداز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔اس میں عربی وفارسی زبان کے الفاظ کے ساتھ ساتھ دکنی زبان کے کچھ الفاظ ومحاورات کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔اس میں دَس مجلس ہیں جس کی مناسبت سے اس کو دَہ مجلس کے کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔اس کے مصنف کے متعلق زیادہ معلومات موجود نہیں ہے البتہ اس کتاب سے اتنا اشارہ ضرور ملتا ہے۔

''المسمی بہ فضل علی والمتخلص بہ فضلی''

اس طرح اردو نثر کے ارتقا میں بہت سارے لوگوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ اردو ادب میں کس علاقے کے صوفیائے کرام نے بیش خدمات انجام دیں؟

﴿۲﴾ حضرت بندہ نواز گیسو دراز کا تعلق کس علاقے سے تھا؟

﴿۳﴾ عبدالحق نے بندہ نواز کی اندازاً کتنی کتابوں کا شمار کیا ہے؟

﴿۴﴾ ''عوارف المعارف'' کس کی کتاب کا نام ہے؟

﴿۵﴾ ''معراج العاشقین'' میں وجود کی کل کتنی اقسام بتائی گئی ہیں؟

﴿۶﴾ شاہ برہان الدین جانم کے والد گرامی کا کیا نام تھا؟

﴿۷﴾ ''وصیت الہادی'' کے مصنف کا کیا نام ہے؟

﴿۸﴾ ''ارشاد نامہ'' کا موضوع کیا ہے؟

﴿۹﴾ مُلاّ وجہی کس بادشاہ کا درباری شاعر تھا؟

﴿۱۰﴾ ''سب رَس'' کس کی فرمائش پر لکھی گئی؟

﴿۱۱﴾ ''سب رَس'' کا سن تصنیف کیا ہے؟

﴿۱۲﴾ ''سب رَس'' کی زبان کیسی ہے؟

﴿۱۳﴾ فضل علی فضلی کی مشہور و معروف کتاب کا کیا نام ہے؟

﴿۱۴﴾ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے ''کربل کتھا'' کا اصل نسخہ کہاں سے حاصل کیا؟

﴿۱۵﴾ ''انوار سہیلی'' کے مصنف کا نام تحریر کیجیے۔

﴿۱۶﴾ کس تخلیق کو ''دہ مجلس'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے؟

﴿۱۷﴾ مقفّی و مسجع عبارت کسے کہتے ہیں؟

05.04 جدید اردو نثر کا ارتقا

جدید اردو نثر کا آغاز فورٹ ولیم کالج کی ادبی و علمی خدمات کے زیر اثر ہوتا ہے۔فورٹ ولیم کالج کا قیام ۱۸۰۰ء میں شہر کلکتہ میں عمل میں آیا۔اس کا بنیادی مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازمین کو مقامی و علاقائی زبانوں سے روشناس و روبرو کروانا تھا تاکہ وہ ہندستانی عوام سے بہتر طریقے سے رابطہ کر سکیں اور حکومتی فرائض انجام دے سکیں۔اس کالج میں مختلف زبانوں میں کتابوں کے تراجم کیے گیے جس میں عربی، فارسی، ہندی، بنگالی اور دیگر مقامی زبانیں شامل تھیں۔فورٹ ولیم کالج نے اردو زبان کو علمی و ادبی شعور و شناخت عطا کیا۔قبل ازیں اُردو روز مرّ ہ کی صرف روزمرّ ہ کی زبان کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔اردو کو ادبی درجہ دینے کے لیے کالج کے لائق اساتذہ نے مختلف موضوعات پر کتابیں تیار کرنے کے ساتھ اہم کتب کے تراجم کر کے شائع کیا۔میر اَمن دہلوی نے فارسی داستان قصۂ چہار درویش اردو میں باغ و بہار کے نام سے ترجمہ کر کے ہندوستانی عوام کے سپرد کیا۔فورٹ ولیم کالج میں تاریخ، تہذیب و جغرافیہ جیسے موضوعات پر وافر مواد تیار کیا گیا۔فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی زبانوں کے شعبے کو جان گل کرسٹ جیسے علم دوست پروفیسر کی سرپرستی حاصل ہوئی۔گل کرسٹ کو اردو زبان میں عبور حاصل تھا، اردو قواعد و لغات کے ساتھ ساتھ کئی دیگر کتب تیار کر کے شائع کروائی جس سے ہندوستانی عوام نے کافی استفادہ کیا۔فورٹ ولیم کالج سے پہلے اردو شاعری کا وافر ذخیرہ موجود تھا لیکن اردو نثر میں خاطر خواں کام نہیں ہوا تھا اس لیے کالج کے اساتذہ و مصنّفین نے اردو نثر پر توجہ مرکوز کی جس سے اردو نثر کا دامن مسلسل وسیع ہوتا گیا۔

فورٹ ولیم کالج میں میر امن (باغ و بہار، گنج خوبی)، میر شیر علی افسوس (شیخ سعدی کی فارسی کتاب گلستاں کا اردو ترجمہ باغِ اردو کے نام سے کیا)، سید حیدر بخش حیدری (آرائشِ محفل)، میر بہادر علی حسینی (میر اَمّن انہیں کے توسط سے فورٹ ولیم کالج میں داخل ہوئے تھے آپ میر منشی کے اہم عہدے پر فائز تھے) انھوں نے میر حسن کی شہرۂ آفاق مثنوی سحر البیان کا اردو نثر میں نثرِ بے نظیر کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔جان گل کرسٹ کی ایماو فرمائش پر مفرح القلوب کا سلیس ترجمہ اخلاقِ ہندی کے نام سے کیا تھا۔

فورٹ ولیم کالج کے دَور میں ہی انشا اللہ خان انشا (ولد ماشا اللہ خان) نے نواب حسین علی خان کی فرمائش پر خالصتاً ہندی زبان میں ۱۸۰۳ء رانی کیتکی کی کہانی جیسی شاہ کار نثری داستان تحریر کی۔رانی کیتکی کی کہانی اردو زبان کی طبع زاد نثری داستان ہے جس میں پوری

داستان میں عربی، فارسی، سنسکرت کا ایک بھی لفظ نہ لانے کا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں مولوی عبدالحق نے اس داستان کو شائع کیا تھا۔ سلکِ گوہر محض ۳۶ صفحات پر مشتمل داستان ہے اس کی خصوصیت ہے کہ اس میں ایک بھی حرف نقطے والا نہیں استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اس داستان کو انشااللہ خان نے صنعتِ غیر منقوطہ یا عاطلہ میں لکھا ہے۔

دریائے لطافت ایک صدف اور سات جزیروں پر مبنی صرف ونحو پر کے موضوع پر لکھی گئی فارسی کتاب ہے۔ دریائے لطافت بنیادی طور پر قواعد کی کتاب ہے۔ ۱۸۲۴ء میں مرزا علی بیگ سرور نے لکھنؤ کی تہذیب وثقافت کی عکاسی وترجمانی کرنے والی داستان فسانۂ عجائب لکھی ہے۔ اس میں لکھنوی رنگ کو دل چسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

جدید اردو نثر کے حوالے سے غالب وسرسید کے ناموں کو ایک ساتھ لیا جاتا ہے۔ محققین ومفکرین کے نزدیک یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ جدید اردو نثر کا معمارِ اوّل کون ہے۔ جدید نثر کے حوالے سے غالب کی نثر خصوصاً خطوط غالب کو کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ غالب سے قبل اردو نثر میں مقفّٰی و مسجع عبارت آرائی کی بہتات تھی۔ مرزا نے اردو نثر کو مقفّٰی و مسجع عبارت کی قید سے آزاد کیا۔ مرزا غالب نے اپنے خطوط کے ذریعہ اردو نثر کی فضا کو یک سر بدل کر رکھ دیا۔ سادگی، برجستگی، بے تکلفی خطوط غالب کا خاصہ ہیں۔ غالب نے اپنے دوست احباب کو جو خط لکھے ہیں ان میں سادگی، ظرافت اور بے تکلف انداز گفتگو استعمال کیا جس سے عبارت کا حُسن دوبالا کر دیا۔ بلاشبہ غالب نے اردو نثر کو نیا اندازِ نگارش عطا کیا تھا۔

سرسید نے اپنی تحریروں کے ذریعہ اردو نثر کے سادہ سلیس اور شگفتہ نثری نمونے پیش کیے۔ غالب کی روش کو اختیار کرتے ہوئے اسے ردیف وقافیہ آرائی سے آزاد کیا۔ سرسید کی انہیں کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی رقم طراز ہیں:

> ''سرسید کی ہی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاق اور تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر و وسعت و جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کی استاد یعنی فارسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہیں، ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بارِ احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔''

غالب وسرسید کے ساتھ ساتھ مولانا محمد حسین آزاد، الطاف حسین حاؔلی، ڈپٹی نظیر احمد اور علامہ شبلی نعمانی کے اسمائے گرامی احترام کے ساتھ لیے جاتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کی آبِ حیات، حالی کی مقدمۂ شعر وشاعری، یادگارِ غالب قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا الطاف حسین حاؔلی نے اُردو ادب کو تنقیدی شعور عطا کیا۔

اس سے پہلے اردو نثر صرف قصے کہانیوں تک ہی محدود تھی۔ نذیر احمد نے اس کو داستان کے تنگ دائرے سے باہر نکال کر ناول نگاری سے روشناس کروایا۔ مولانا محمد حسین آزاد کی تحریروں میں تاریخی حقائق کا فقدان ہے لیکن نیرنگ خیال کے نظریہ سے ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا نے ''نیرنگِ خیال'' میں جس طرح سے تمثیلی پیرائے کا بخوبی استعمال کیا ہے قابل ستائش ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱۸﴾ فورٹ ولیم کالج کا قیام کس شہر میں ہوا؟

﴿۱۹﴾ باغ و بہار کے مصنف کا کیا نام ہے؟

﴿۲۰﴾ قصہ چہار درویش کس کی کتاب ہے؟

﴿۲۱﴾ شیخ سعدی کی گلستاں کا اردو ترجمہ کس نے کیا ہے؟

﴿۲۲﴾ رانی کیتکی کی کہانی کے مصنف کا نام کیا ہے؟

﴿۲۳﴾ دریائے لطافت میں کتنے صدف و جزیرے ہیں؟

05.05 جدید اردو نثر کی اصناف

اُردو نثر کو بنیادی طور پر دو شاخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے :

﴿۱﴾ افسانوی نثر ﴿۲﴾ غیر افسانوی نثر

﴿۱﴾ افسانوی نثر :

افسانوی نثر میں کہانی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔اس میں لکھی جانے والی تحریریں کلی و جزوی طور پر مصنف کے دماغ کی اختراع و تخیل پر مبنی ہوتی ہے۔اس نثر کا بنیادی مقصد دلچسپ واقعات کو کہانی کی شکل میں پیش کر کے ذہنی سکون فراہم کرنا ہوتا ہے۔کبھی کبھی نثر نگار کسی اہم پیغام کو مؤثر انداز میں پہنچانے کے لیے اپنے تخیلاتی اندازِ نگارش کا استعمال کرتا ہے۔

افسانوی نثر کی مختلف اقسام ہیں جن کو اسلوب، ساخت اور مقاصد کے اعتبار سے تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) داستان : اس میں، مہماتی اور مافوق الفطرت عناصر کی بھرمار ہوتی ہے۔طوالت کے ساتھ روایتی قصہ گوئی داستان کی بنیادی خصوصیت ہے۔ چند اہم داستان درج ذیل ہیں۔طلسمِ ہوش ربا، سب رَس (مُلّا وجہی)، کربل کتھا (فضل علی فضلی)، رانی کیتکی کی کہانی (انشا اللہ خان انشا)، باغ و بہار (میر امن دہلوی)، فسانۂ عجائب (رجب علی بیگ سرور) وغیرہ۔

(۲) ناول : کردار، واقعات، ماحول اور پلاٹ پر مبنی طویل افسانوی صنف ہے۔امراؤ جان ادا (مرزا ہادی رسوا)، گودان (منشی پریم چند)، آگ کا دریا (قرۃ العین حیدر)، ایک چادر میلی سی (راجندر سنگھ بیدی)، فسانۂ آزاد (پنڈت رتن ناتھ سرشار)، ٹیڑھی لکیر (عصمت چغتائی) وغیرہ۔

(۳) افسانہ : مختصر لیکن جامع افسانوی تحریر ہوتی ہے۔ایجاز واختصار اس کا بنیادی عنصر ہے۔اس میں کرداروں کی تعداد اکثر و بیشتر محدود ہوتی ہے جیسے: کفن (منشی پریم چند)، چوتھی کا جوڑا (عصمت چغتائی)، نیا قانون (سعادت حسن منٹو)، گرم کوٹ (راجندر سنگھ بیدی) وغیرہ۔

(۴) طنز ومزاح : اس میں نہایت مزاحیہ انداز میں سماجی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی موضوعات پر دل کش تحریر لکھی جاتی ہیں۔ جیسے مشتاق احمد یوسفی، رشید احمد صدیقی، احمد جمال پاشا، کنہیالال کپور، پطرس بخاری وغیرہ کی تحریریں۔

﴿۲﴾ غیر افسانوی نثر :

ایسی تحریریں جو حقیقی واقعات، مشاہدات اور علمی وفکری موضوعات پر مبنی ہوتی ہیں غیر افسانوی نثر کے زمرے میں آتی ہیں۔ جیسے: سفرنامہ، سوانح نگاری، خودنوشت، خاکہ، رپورتاژ، علمی، ادبی اور تحقیقی وتنقیدی مضامین، ترجمہ نگاری وغیرہ۔

(۱) سفرنامہ : سفر کے دَوران مشاہدات، تجربات اور تاثرات کو جب تحریر کے قالب میں ڈالا جاتا ہے اسے اصطلاح میں سفرنامہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جیسے سرسید احمد خان کا مسافرانِ لندن، علامہ شبلی نعمانی کا سفرنامۂ روم ومصر وحجاز، محمد حسین آزاد کا سیرِ ایران وغیرہ۔

(۲) سوانح نگاری : اس میں کسی مشہور ومعروف شخصیت کی زندگی، کارناموں اور ادبی وسماجی خدمات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ جیسے سرسید کی سوانح حیات جاوید مولانا الطاف حسین حالؔی نے لکھی ہے اس میں سرسید کے مکمل حالات زندگی اور کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

(۳) خاکہ : کسی شخصیت یا کردار کی عادات واطوار، حسن وقبح کا مزاحیہ یا سنجیدگی سے نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ اختصار، وحدت تاثر، کردار نگاری، مثالی کردار، منظرکشی ایک اچھے خاکے کے فنی لوازم تسلیم کیے جاتے ہیں۔ جیسے نام دیو مالی (از مولوی عبدالحق)، کندن (از رشید احمد صدیقی) وغیرہ۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۲۴﴾ ''آگ کا دریا'' کے ناول نگار کا کیا نام ہے؟

﴿۲۵﴾ داستان کی بنیادی خصوصیت کیا ہے؟

﴿۲۶﴾ افسانہ ''چوتھی کا جوڑا'' کس افسانہ نگار نے لکھا ہے؟

05.06 خلاصہ

جس طرح انگریزی ادب میں شاعری کی نشوونما نثر سے پہلے ہوئی ٹھیک اسی طرح اردو ادب میں بھی شاعری نثر سے پہلے معرضِ وجود میں آئی۔ اردو نثر نے بھی شاعری کے شانہ بشانہ ترقی کے منازل طے کیے۔ دکن میں اردو کی ترقی میں بندہ نواز گیسو دراز، میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم جیسے روحانی پیشواؤں کے ذریعہ پروان چڑھی۔ حضرت بندہ نواز نے اپنی مشہور کتاب معراج العاشقین میں تقویٰ و طہارت، شریعت وطریقت اور اخلاقیات کے دقیق مسائل سے بحث کی گئی ہے۔

فضل علی فضلی کی ''کربل کتھا''، ملاوجہی کی ''سب رس'' اردو نثر کے ابتدائی نمونے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر کو ادبی وعلمی شعور عطا کیا۔ انشااللہ خان کی ''رانی کیتکی کی کہانی''، میرامن کی ''باغ وبہار''، محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات''، نیرنگِ خیال، غالب کے خطوط، سرسید کی آثارالصنادید، مولانا آزاد کے خطوط کا مجموعہ ''غبارِ خاطر''، مولانا الطاف حسین حالؔی کی ''حیاتِ جاوید'' جیسی تخلیقات نے جدید اردو نثر کی بنیاد کو مضبوط کیا۔

جدید اُردو نثر کی تقسیم افسانوی اور غیر افسانوی نثر کے طور پر کی جاتی ہے۔

افسانوی نثر: افسانوی نثر میں کہانی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔اس میں لکھی جانے والی تحریریں کلی و جزوی طور پر مصنف کے دماغ کی اختراع و تخیل پر مبنی ہوتی ہے۔اس نثر کا بنیادی مقصد دلچسپ واقعات کو کہانی کی شکل میں پیش کر کے ذہنی سکون فراہم کرنا ہوتا ہے۔کبھی کبھی نثر نگار کسی اہم پیغام کو موثر انداز میں پہنچانے کے لیے اپنے تخیلاتی اندازِ نگارش کا استعمال کرتا ہے۔جیسے داستان، ناول، ناولٹ، افسانہ، مختصر افسانہ، انشائیہ وغیرہ۔

غیر افسانوی نثر: ایسی تحریریں جو حقیقی واقعات، مشاہدات اور علمی و فکری موضوعات پر مبنی ہوتی ہیں غیر افسانوی نثر کے زمرے میں آتی ہیں۔جیسے: سفرنامہ، سوانح نگاری، خودنوشت، خاکہ، رپوتاژ، علمی، ادبی اور تحقیقی و تنقیدی مضامین، ترجمہ نگاری وغیرہ۔

05.07 خلاصہ

احاطہ	: چاردیواری	عبارت آرائی	: اہتمام کے ساتھ عبارت لکھنا
اختراع	: جدت، فنکارانہ ایجاد	عکاسی	: تصویر کشی، فوٹوگرافی
استفادہ	: نفع اٹھانا، فائدہ حاصل کرنا	علمِ تصوّف	: وہ علم جس کے ذریعہ معرفت الٰہی کے مدارج طے ہوتے ہیں
اشاعت	: پھیلانا		
اندازِ نگارش	: لکھنے کا طریقہ	عناصر	: اجزائے ترکیبی
اوّلین	: سب سے پہلی	غیرمنقوطہ	: ایسی عبارت جس میں ایسے الفاظ لانے کا اہتمام کیا گیا ہو جو بلا نقطے کے ہوتے ہیں جیسے ح، ع، د، ر وغیرہ
ایجاز	: کسی چیز کو کم کرنا		
برجستگی	: برمحل، مقتضائے حال کے مطابق کوئی بات کہنا		
بیشتر	: زیادہ تر	فائز ہونا	: کسی عہدے پر مامور ہونا
پروان چڑھنا	: بڑا ہونا	فقدان	: کمی، قلت
پند	: نصیحت جو معرفت سے متعلق ہے	قالب	: ڈھانچا، فرما
تحقیق طلب	: جس میں تحقیق کرنے کی ضرورت ہو	کلی طور پر	: پوری طور پر
تخیل	: خیال کرنا، دھیان میں لانا، فکر	گنجلک	: جسے سمجھنے اور پڑھنے میں دشواری ہوتی ہو
ترجمانی	: ایک زبان کا مطلب دوسری زبان میں بیان کرنا	مافوق الفطرت	: فوق العادات باتیں
		محدود	: جس کی حد بندی کر دی گئی ہو
ترویج	: کسی چیز کا پرچار کرنا، تشہیر کرنا	محققین	: محقق کی جمع، تحقیق کرنے والا
تقویٰ	: اللہ کا خوف جس کی وجہ سے انسان گناہوں سے باز رہتا ہے	مختلف فیہ	: جس بات میں باہم اختلاف پیدا ہو جائے
		مدلل	: دلیل کے ساتھ

توجہ مرکوز کرنا	:	پورے طور پر دھیان دینا	مسجع	:	ایسی عبارت جس کو اچھے سے مزیّن کیا گیا ہو
توسط	:	ذریعہ، وسیلہ	مسکن	:	رہنے کی جگہ
جامعیت	:	جو بہت زیادہ معانی کو رکھتا ہو	مشاہدات	:	مشاہدہ کی جمع، عینی تجربہ
جزوی	:	تھوڑا تھورا، کم مقدار و تعداد میں	مشترک	:	ایسی چیز جس میں دو یا اس سے زیادہ چیزیں شریک ہوں
خاطر خواں	:	خواہش کے مطابق			
دقیق	:	مشکل، پیچیدہ	معاشرتی	:	معاشرے سے متعلق
دل کش	:	دل کو بھانے والا	معمار	:	بنیاد رکھنے والا، بنیاد گزار
دل گداز	:	دل کو نرم کرنے والا	مفکرین	:	مفکر کی جمع، غور و فکر کرنے والا
ذی مرتبت	:	مرتبے والے	مقفّٰی عبارت	:	ایسی عبارت جس میں لہجہ و طرز ملتی ہو
رشد و ہدایت	:	نیک یا سیدھا راستہ دکھانا	موسوم	:	نام دیا گیا
روشناس	:	روبرو، تعارف	موسوم کرنا	:	نام رکھنا
زمرہ	:	گروپ، گروہ، جماعت	مہماتی	:	مہمات سے منسوب
ساخت	:	بناوٹ	نفسِ امّارہ	:	جو نفس ہمیشہ برائی کرنے کی ترغیب دیتا ہے
سلیس	:	سادہ، آسان، عام فہم	واضح	:	کسی بات کا صاف ہونا
صدف	:	سیپی جو سمندر میں پائے جاتے ہیں	وسعت	:	کشادگی
ظرافت	:	خوش مزاجی، خوش طبعی	یک سر بدل دینا	:	ایک دم سے کوئی تبدیلی کر دینا

05.08 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ : حضرت بندہ نواز گیسو دراز کے متعلق ایک مضمون تحریر کیجیے۔

سوال نمبر ۲ : برہان الدین جانم کے والد کون تھے اور آپ کی ادبی خدمات کیا ہیں؟

سوال نمبر ۳ : جدید اردو نثر کے تعلق سے فورٹ ولیم کالج کے کردار کی وضاحت کریں؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ : ''سب رَس'' پر ایک مضمون قلم بند کیجیے؟

سوال نمبر ۲ : جدید اردو نثر کی اصناف کے موضوع پر ایک مضمون تحریر کیجیے۔

سوال نمبر ۳ : فورٹ ولیم کالج کے مصنّفین کے متعلق اپنی معلومات تحریر کیجیے؟

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : مافوق الفطرت عناصر کیا ہوتے ہیں؟

(الف) جو قانون فطرت سے بالاتر ہوں (ج) جنگلی حیوانات

(ب) جو فطرت کے مطابق ہوں (د) ان میں سے کوئی نہیں

سوال نمبر۲ : معراج العاشقین کس کی کتاب ہے؟

(الف) برہان الدین جانم (ب) ہاشمی (ج) بندہ نواز (د) ملاوجہی

سوال نمبر۳ : کندن کس کا خاکہ ہے؟

(الف) عبدالحق (ب) رشید احمد (ج) احمد جمال پاشا (د) پطرس بخاری

سوال نمبر۴ : غبارِ خاطر کس کی کتاب ہے؟

(الف) ابوالکلام آزاد (ب) عبدالحق (ج) حالی (د) شبلی

سوال نمبر۵ : درج ذیل میں غیر افسانوی نثر کی مثال کی نشان دہی کیجیے۔

(الف) داستان (ب) افسانہ (ج) خاکہ (د) ناول

سوال نمبر۶ : درج ذیل میں افسانوی نثر کی مثال کی نشان دہی کیجیے۔

(الف) ناول (ب) مضمون (ج) سوانح (د) خاکہ

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (الف) جو قانون فطرت سے بالاتر ہوں

جواب نمبر۲ : (ب) رشید احمد

جواب نمبر۳ : (ج) خاکہ

جواب نمبر۴ : (ج) بندہ نواز

جواب نمبر۵ : (الف) ابوالکلام آزاد

جواب نمبر۶ : (ب) ناول

05.09 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام از مولوی عبدالحق

۲۔ تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ

۳۔ دکن میں اردو از نصیر الدین ہاشمی

۴۔ سب رَس از ملاوجہی

۵۔ غبارِ خاطر از مولانا ابوالکلام آزاد

05.11 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

۱) دکن کے علاقے میں صوفیائے کرام نے اردو ادب کی بیش خدمات انجام دیں۔

۲) حضرت بندہ نواز کا تعلق دکن سے تھا۔

۳) سو ۱۰۰ کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

۴) ''عوارف المعارف'' حضرت بندہ نواز گیسودراز کی کتاب ہے۔

۵) معراج العاشقین میں وجود کی کل پانچ اقسام بتائی گئی ہیں۔

۶) شاہ برہان الدین جانم کے والد گرامی کا نام میراں جی شمس العشاق تھا۔

۷) وصیت الہادی کے مصنف برہان الدین جانم ہیں۔

۸) ارشادنامہ کا موضوع تصوّف ہے۔

۹) ملا وجہی کس عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔

۱۰) سب رَس عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر لکھی گئی۔

۱۱) سب رَس کا سن تصنیف ۱۰۴۵ھ ہے۔

۱۲) دشوار

۱۳) ''کربل کتھا''

۱۴) پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے کربل کتھا کا اصل نسخہ ٹیوب گن سے حاصل تھا۔

۱۵) انوار سہیلی کے مصنف کا نام مُلاّ حسین بن علی الواعظ الکاشفی ہے۔

۱۶) فضلی کی کربل کتھا کو دہ مجلس کے نام سے بھی جان جاتا ہے۔

۱۷) ہم آہنگ الفاظ سے سجی ہوئی عبارت کو مقفّٰی و مسجع عبارت کہا جاتا ہے۔

۱۸) فورٹ ولیم جالج کا قیام شہر کلکتہ میں ہوا۔

۱۹) میر امن

۲۰) قصہ چہار درویش

۲۱) شیخ سعدی کی گلستاں کا اردو ترجمہ میر شیر علی افسوس نے کیا تھا۔

۲۲) انشااللہ خان انشا

۲۳) ایک صدف اور سات جزیرے

﴿۲۴﴾ قرۃ العین حیدر

﴿۲۵﴾ داستان کی بنیادی خصوصیت مافوق الفطرت عناصر کی بھرمار

﴿۲۶﴾ عصمت چغتائی

٭

اکائی 06 جدید اُردو شاعری

ساخت

06.01 : اغراض ومقاصد
06.02 : تمہید
06.03 : جدید اُردو شاعری کا پس منظر
06.04 : جدید اُردو شاعری
06.05 : جدید اُردو شاعری کے نمائندہ شعرا
06.06 : خلاصہ
06.07 : فرہنگ
06.08 : نمونہ امتحانی سوالات
06.09 : حوالہ جاتی کتب

06.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ جدید اُردو شاعری کا پس منظر اوراس کی خصوصیات کا تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔ جدید اُردو شاعری کیا ہے اور اس کے کون کون نمائندہ شعرا ہوئے اس کا بھی آپ مطالعہ کریں گے۔ جس سے آپ کو جدید اُردو شاعری سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ اس کے بعد اس اکائی کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔ ساتھ ہی اکائی میں فرہنگ بھی دی جائے گی جس کے ذریعے آپ مشکل الفاظ کے معانی سمجھ سکیں گے۔ اس کے بعد نمونہ امتحانی سوالات دیئے گئے ہیں علاوہ ازیں معروضی سوالات اوران کے جوابات پیش کیے جائیں گے۔ آخر میں حوالہ جاتی کتب پیش کی جائیں گی۔ اکائی کے مطالعے کے بعد آپ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ جدید اُردو شاعری کے تعلق سے آپ کی معلومات میں یقیناً اضافہ ہوجائے گا۔

06.02 تمہید

بادشاہ محمد شاہ کی کمزور حکومت نے نادر شاہ کو دہلی پر چڑھائی کرنے کا دعوت نامہ پیش کیا۔ دہلی کا اجڑنا کیا ہوا کہ مغل شہنشاہوں کا علم و فضل اور آرٹ کا سلسلہ بہت بری طرح بکھرنے لگا۔ اس وقت دہلی میں جو معروف شعرا تھے خاص طور پر میرؔ وسوداؔ دونوں دہلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ چلے گئے اور وہاں جا کر نواب آصف الدولہ کے دربار میں پناہ لی۔ اس وقت لکھنؤ علم وادب کا مرکز بن چکا تھا۔ میرؔ وسوداؔ کی طبع آزاد نے دہلی کے پراگندہ شعرا کے لئے لکھنؤ میں بساطِ سخن بچھادی۔ جب ان اساتذہ کا آخری زمانہ تھا تب انشاؔ، مصحفیؔ اور جرأتؔ ان کی جگہ لینے کے لئے آگے بڑھتے چلے جارہے تھے۔ جب دہلی اجڑ چکی تھی تب اسی دَوران ایک مشہور ومعروف شاعر کی ولادت ہوتی ہے۔ جس کا نام نظیرؔ

اکبرآبادی ہوتا ہے۔لیکن ابھی اس نئے شاعر نے صحیح طرح سے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ اس کے اُوپر مصائب وآلام کے بادل منڈلانے لگے اور دہلی پر احمد شاہ ابدالی نے حملہ کر دیا جس کی وجہ سے افراتفری مچ گئی۔یہی سب کچھ دیکھتے ہوئے نظیر کی والدہ انہیں سب سے چھپا کر اپنے ساتھ ہجرت کر کے اکبرآباد(آگرہ) لے آئیں۔آگرہ میں ہی ان کی پرورش و پرداخت ہوئی۔نہ جانے اس آزاد خیال انسان نے کس ڈھنگ کی طبیعت پائی تھی کہ میر،سودا،انشا اور مصحفی جیسے شاعروں کے دَور میں پرورش پاکر بھی ان شعرا کی شاعری سے پوری طرح متاثر نہیں ہو پائے اور اپنی روِش خود اختیار کی۔عام شاعروں کی طرح لکھنؤ کی طرف مڑکر نہیں دیکھا اور پوری طرح سے اکبرآباد ہی میں مقیم ہو گئے۔اس اکیلے پن میں وہ نغمہ سرائی شروع کی جو اپنی انفرادیت کے سبب اکثر ناقدین ومؤرخین کو حیرت میں ڈال رہی تھی۔''تاریخ ادب اُردو'' مرتب رام بابو سکسینہ جی لکھتے ہیں کہ

> ''ان کا طرزِ کلام بھی ایک عجیب رنگ رکھتا ہے۔قدما میں ان کا شمار اس وجہ سے نہیں ہوسکتا کہ ان کا اکثر کلام زمانۂ حال کا معلوم ہوتا ہے۔متوسطین شعرائے دہلی میں بھی یہ نہیں لئے جاسکتے،اس وجہ سے کہ ان کے کلام میں بہت آزادہ روئی ہے۔ان کے اُردو کے مضامین اور انداز میں زمین آسمان کا فرق ہے۔لکھنؤ کا قدیم طرز تو اُن میں چھوتک نہیں گیا ہے۔کیوں کہ ان میں بناوٹ اور رنگینی جو طرزِ لکھنؤ کی خاص پہچان ہے، مطلق نہیں پائی جاتی۔اسی طرح دَورِ جدید کے شعرائے دہلی مثلاً غالب،ذوق اور مومن بغیرہ سے بھی یہ بالکل علاحدہ ہیں۔اس وجہ سے کہ ان کے یہاں سادگی ہے اور فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کا ان کو مثل ان کے مطلق شوق نہیں ہے۔''

نظیر کی شاعری پر قابل قدر بحث کرنے کے بعد رام بابو سکسینہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ

> ''زمانۂ موجودہ کی فطری اور قومی شاعری جس کی ابتدا مولانا آزاد اور حالی سے کہی جاتی ہے۔اس کے پیش رو بلکہ موجد نظیر اکبرآبادی کہے جاسکتے ہیں۔''

بے شک نظیر اکبرآبادی سچے ہندوستانی شاعر ہیں جن کی شاعری میں جدید اُردو شاعری کے حسیں امتزاج کا ذخیرہ موجود ہے لیکن پھر بھی نظیر کی شاعری کو جدید اُردو شاعری کا موجد نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ ان کی شاعری انہیں تک محدود ہو کر رہ گئی اور ان کے جانے کے بعد برسوں تک قدیم شاعری کا دَور قائم رہا۔غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اب سے کچھ سال پہلے تک اُردو ادب کے کچھ نقاد انہیں شاعر ماننے سے ہی انکار کرتے رہے کیوں کہ ان کی شاعری عام طرز سے الگ تھی۔ایسے مخالف ماحول میں نظیر کی شاعری کسی نئے عہد کا پیش خیمہ نہیں ہوسکتی تھی۔

06.03 جدید اردو شاعری کا پس منظر

اُردو ادب میں محمد حسین آزاد کو جدید اُردو شاعری کے بانیوں میں سرِفہرست رکھا گیا ہے۔آزاد نے شیخ ابراہیم ذوق جیسے قابل استاد کی صحبت اختیار کی۔جس نے آزاد کے دل ودماغ کو کھول دیا اور ان کے مذاق شعری اور قوت لسانی کو بہت اچھی طرح سنوار دیا لیکن پھر بھی آزاد کے جیسا قابل شخص جس کے پاس بہترین دل ودماغ ہو کبھی ایک جگہ پر ٹک کر نہیں رہ سکتا۔وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ نیا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔روزگار کی تلاش میں وہ لاہور گئے۔جب ان کی معاشی پریشانیاں پہلے کے مقابل تھوڑی کم ہونے لگیں تب ان کے ذہن نے اچھی

طرح سے کام کرنا شروع کیا اور ان کی جدیدیت سے بھری سوچ نے نئے نئے طریقے ایجاد کرنا شروع کر دیے۔ اگست ۱۸۶۷ء میں ''انجمن پنجاب'' نے ایک جلسہ منعقد کیا تھا، جس میں محمد حسین آزاد نے قدیم شاعری کے زوال کا مرثیہ بیان کیا۔ اس کے بعد شعر کے مقصدِ اصلی کو کچھ اس طرح بیان کیا۔

> ''شعر گلزارِ فصاحت کا پھول ہے۔ گلہائے الفاظ کی خوشبو ہے۔ روشنی عبارت کا پرتو ہے۔ روح کے لئے آبِ حیات ہے۔ گردِ غم کو دل سے دھوتا ہے۔ طبیعت کو بہلاتا ہے۔ خیال کو عروج دیتا ہے۔ دل کو استغنا و بے نیازی اور ذہن کو قوت پرواز دیتا ہے۔''
>
> (نظم آزاد ''نظم اور خیال موزوں کے باب میں خیالات'' ص۔۱۶، ۱۷)

محمد حسین آزاد نے اپنے طریقے سے یہ کوششیں شروع کر دیں لیکن اس زمانے تک ان کی غیر اہم شخصیت عوام پر ان کے خیالات کے اثر جمنے نہیں دیتی تھی اس لئے انہوں نے کرنل ہالرائڈ کو جو سررشتۂ تعلیم پنجاب کے ناظم تھے، اُردو شاعری کے طریقۂ قدیم کو تبدیل کرنے میں وہ ان کی مدد فرمائیں۔ اس بات پر انہیں ۱۸۷۴ء میں آمادہ کیا گیا۔ محمد حسین آزاد کے ذہن میں ایک خیال آیا کہ کیوں نہ ''انجمن پنجاب'' کی سرپرستی میں جدید طرز کے مشاعروں کا انعقاد کیا جائے، جن کا مقصد مصرعِ طرح پر نہ لکھ کر بلکہ موضوع پر اشعار کہے جائیں۔ آزاد کی یہ کوشش بہت کامیاب ہوئی۔ یہ بھی اتفاق کی بات ہے کہ جس طرح ایک انگریز حاکم جان گلکرسٹ نے اُردو نثر کو بنانے میں شرکت کی تھی، خاص اسی طرح جدید اُردو شاعری کی بنیاد رکھنے میں بھی ایک انگریز حاکم کا ہی ہاتھ ہے۔ آزاد کی کوششوں کو برباد ہونے سے کرنل ہالرائڈ نے کافی حد تک بچایا تھا۔ سچ میں ان کی یہ اصلاحی مہم کسی خاص شخصیت کی جانب سے مادی اور اخلاقی مدد کی محتاج تھی۔ جنگِ آزادی کے قریب اُردو شاعری میں انقلاب لانے کے لئے ماحول تیار کیا گیا۔ نئے مزاج کے شعرا کے لئے اگر کرنل جیسا ذی اثر حاکم ایک مرکز مہیا نہ کرتا تو اُردو ادب کے شعرا کا مقصدِ اصلی بدلتے بدلتے طویل زمانہ لگ جاتا۔ اس طرح کرنل ہالرائڈ کی جدید شاعری کے اولین بانیوں میں گویا دوسری شخصیت ہے۔ عربی، فارسی کی طرح کرنل ہالرائڈ کو اُردو زبان وادب سے خاص دل چسپی تھی۔ محمد حسین آزاد سے مل کر کرنل ہالرائڈ نے بھی یہ محسوس کیا کہ مروّجہ اُردو شاعری اپنے اصل راستے سے کافی دور ہٹ گئی ہے۔

مصرعِ طرح پر غزل لکھنے کی جو عادت اُردو شعرا میں پڑ گئی تھی اس کو انجمنِ پنجاب کے جدید مشاعروں نے اس کو ختم کر دیا۔ اُردو شاعری کو عروج پر لے جانے میں مشاعرے بہت ہی مددگار ثابت ہوئے۔ خاص طور پر دیکھا گیا کہ تقریباً تمام اساتذہ کے مذاقِ شعری کو سجانے میں مشاعروں نے بہت اہم رول ادا کیا۔ مشاعرے ہونے سے خاص فائدہ یہ ہوا کہ جتنے بھی اُردو جاننے والے لوگ تھے ان کی طبیعتیں مشاعروں سے آشنا ہوئیں۔ اس لئے کوئی بھی ایسا ذریعہ کارگر ثابت نہیں ہوا جو کہ جدید شاعری کو عوام کے بیچ آسانی پہنچا سکے اور اسے مقبولیت کا درجہ عطا کر سکے۔ یہ مشاعرے ہی ذریعہ ثابت ہوئے جن کی وجہ سے جدید شاعری کونے کونے تک پہنچ گئی۔ ایک مرتبہ یہ تصور کیجیے کہ جب پہلی بار جدید مشاعرے کے منعقد ہونے کا اعلان ہوا ہوگا تب کس طرح سے اس اعلان نے عوام کے ذہن ودل پر اس کی کیفیت اور اس کی سوچ کو کس حد تک متاثر کیا ہوگا اور کیا کیا ذہن میں خیالات پیدا ہوئے ہوں گے۔ کیوں کہ وہ عوام کے لئے بالکل مختلف چیز تھی جس کا وہ

اب سامنا کرنے جارہے تھے۔ایک بات کا اور خیال کریئے کہ وہ مجمع جو شعرا کو سننے اور دیکھنے کے لئے آیا تھا وہ سوچ میں گم ہوگا اور کیا کیا باتیں اس کے ذہن میں چلتی ہوں گی کہ اس کے بعد اب عوام پر کیا فرق پڑنے والا ہے اور کیا کیا فائدے یا نقصانات ہونے والے ہیں۔مشاعرہ کرانے والوں کو بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کی اس طرح کی کوشش کامیاب ہوجائے گی!اس سے جو پرانی یا روایتی شاعری کو زور کا دھچکا لگے گا اور جدید شاعری میں نئے نئے موضوع، نئے نئے اسالیب اور نئے نئے اصنافِ سخن ایجاد ہوں گی اور وہ بے حد مقبول ہوجائیں گی۔

06.04 جدید اُردو شاعری

یہ بات کافی حد تک سچائی پر مبنی ہے کہ کرنل ہالرائڈ ایک بہترین شخصیت کا مالک تھا۔اس نے اپنی زندگی میں اُردو کو بہت فروغ بخشا لیکن یہ بھی طے تھا کہ اُردو تحریک ایک گوشے میں بے دَم پڑی رہتی اگر محمد حسین آزادؔ اور خواجہ الطاف حسین حالیؔ جیسی شخصیتیں اس تحریک کو عملی شکل عطا کرنے میں حصہ نہ لیتے۔حالیؔ نے اس تحریک کی اشاعت میں بھی ساتھ دیا اور اس کو بھرپور طریقے سے عوام کے سامنے پیش کیا جس کی دھاک آج تک جدید اُردو شاعری پر جمی ہوئی ہے۔ایک بات ہمیشہ ذہن میں رہے کہ کتنے بھی اچھے لوگ کسی معرکہ،فوج یا کسی مہم کے سربراہ کیوں نہ ہوں وہ کامیابی کی منزل طے نہیں کرسکتی جب تک اس کے لئے اچھے لوگ دستیاب نہ ہوں۔جیسے کوئی انجینئر ہے وہ بھلے ہی کتنا قابل ہو لیکن جب تک اس کے پاس بہترین کاری گر نہ ہوں (جو عمارت بناتے ہیں) وہ انجینئر بے کار ہے کیوں کہ صرف اس سے کچھ نہیں ہوگا جب تک کاری گر نہ ہوں۔انجینئر نقشہ بنا کر دیتا ہے اور اس کام کو انجام دینا معمار اور مزدوروں کا کام ہے۔اسی طرح جدید اُردو شاعری ہے۔اس میں بھی صرف حالیؔ اور آزادؔ سے سب کچھ ممکن نہیں تھا جب تک اور شعرا اور نثر نگاروں نے حصہ نہ لیا ہوتا لیکن یہ بات بھی بالکل سچ ہے کہ ان دونوں کی ہی دین ہے جو آج جدید اُردو شاعری ہمارے درمیان زندہ نظر آرہی ہے اس کے بانی حالیؔ اور آزادؔ ہی ہیں اور کمال کی بات یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں اور دونوں حضرات نے ایک دوسرے کی خوب مدد کی جو آج بھی اس تحریک کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔دونوں ہی اپنی اپنی جگہ بہتر تھے۔نئے لوگوں سے یہ کام ہونا بہت ہی مشکل تھا۔اگر ہم بات کریں ان دونوں کی قابلیت اور علمیت اور ادبی کارناموں کی تو ان کی قابلیت کا ڈنکا ابتدا ہی میں بجنے لگا تھا،جس کی گونج آج تک اُردو ادب میں ہے۔محمد حسین آزادؔ کی شہرت جدید اُردو شاعری سے پہلے بھی تھی اور اس کے بعد تو وہ عوام کے دلوں میں اپنی ایسی جگہ بنا گئے جو آج تک اُردو ادب میں اپنی الگ چھاپ چھوڑے ہوئے ہے۔وہ ایک بہت ہی اچھی شخصیت کے مالک تھے۔انہوں نے رسم پرستی اور جو غلط روایات تھیں ان کو ترک کیا اور جدت وندرت کو آگے بڑھایا۔آزادؔ نے آنے والی نسل کے لئے بہت آسانیاں پیدا کردیں۔وہ خود بھی مختلف نظریات پیش کرتے رہے اور دوسرے شعرا و اُدبا کو بھی اپنے جدید رنگ میں رنگ لیا۔ان کی قابل قدر کوششوں نے اور ان کے عمدہ مزاق،اچھی طبیعت اور قدرت زبان نے اس دَور میں جدید اُردو شاعری کے عمدہ تخیل کو بلندی عطا کی۔

ایک بات طے ہے اگر خواجہ الطاف حسین حالیؔ،آزادؔ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہ چلتے اور ان کی مدد نہ کرتے تو جدید اُردو شاعری کا بہت بڑا نقصان ہوجاتا جس کی بھرپائی شاید ہی کوئی کر پاتا۔آزادؔ کا دائرہ صرف شاعری تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ وہ اسے ثانوی نظریے سے دیکھتے تھے۔جتنا انہوں نے شاعری میں کام کیا اس سے کہیں زیادہ نثر میں بھی کام کیا لیکن جتنی شہرت حالیؔ کو ملی اتنی آزادؔ کو نہیں مل سکی۔حالیؔ نے سب سے پہلے شاعری شروع کی اس کے بعد نثر نگاری۔جتنا حالیؔ کو اُردو ادب ایک شاعر کی حیثیت سے جانتا ہے اس سے کہیں زیادہ انہیں نثر

نگار کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے۔ان کی ''مقدمہ شعر و شاعری'' بہت ہی مقبول تصنیف ہے جس کی بنا پر ان کی پورے اُردو ادب میں اپنی الگ ہی پہچان ہے۔ ایک بات اور سامنے نکل کر آتی ہے کہ محمد حسین آزاد نے جس فن کی بنیاد رکھی اس کو حالی نے مرتب کر کے شائع بھی کیا۔ حالی نے اُردو ادب میں بڑا کام کیا۔ وہ اپنے کام کو بہت ہی دل چسپی کے ساتھ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے ان کا مذاق اُڑایا اور ان کی مخالفت بھی کی لیکن وہ اپنے کام پر جی جان سے ڈٹے رہے۔ حالی نے اپنی زندگی میں جو سب سے بڑا کارنامہ انجام دیا وہ اُردو شاعری کی اصلاح ہے اور ان کی اصلاحی کوششوں میں سب سے مقبول کوشش ''مقدمہ شعر و شاعری'' ہے۔جس کا ذکر ہم اُوپر کر چکے ہیں۔ جس کی مقبولیت جدید شاعری کے تخیل کی پیدائش کا سبب بنی۔

اُردو ادب کا ذکر ہو (خاص طور پر جدیدیت کا) اور اس میں سر سید احمد خاں کا ذکر نہ ہو تو سمجھو کہ وہ ادب ادھورا ہے۔ جہاں محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی کا جدید اُردو شاعری کے بانیوں میں نام شامل ہے تو وہیں آخر میں سر سید کا بھی نام شامل ہے۔اصل میں انہوں نے جو کام انجام دیا اس کی بنا پر وہ ہمیں اپنا ذکر کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ان کے بارے میں ایک بات بہت خاص ہے کہ وہ شاعر تو بے شک نہیں تھے لیکن ان کی طبیعت شاعرانہ ضرور تھی۔ وہ شاعری سے بے حد متاثر تھے۔اس کا اندازہ ان کے مشہور و مقبول، معاشرتی اور اصلاحی ماہنامہ ''تہذیب الاخلاق'' سے لگایا جاسکتا ہے۔جس کو سر سید نے انگلستان سے واپسی پر ۲۴؍دسمبر ۱۸۷۰ء کو علی گڑھ سے جاری کیا تھا۔ ''تہذیب الاخلاق'' کی اشاعت کا مقصد عام مسلمانوں کی ذہن سازی تھا۔انہوں نے بَرِّصغیر کے مسلمانوں کی تعلیمی و سماجی پسماندگی کو محسوس کرتے ہوئے ان کی اصلاح اور ترقی کے لئے اہم اقدامات کیے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں کی حالت نہایت خراب ہو چکی تھی۔ان کے سر پر بغاوت کا الزام تھا وہ انگریزی حکومت سے بدظن تھے اور تعلیم سے دور ہو چکے تھے۔ان حالات میں سر سید نے مسلمانوں کی فلاح کا بیڑا اُٹھایا۔

06.05 جدید اُردو شاعری کے نمائندہ شعرا

اُردو شاعری کی روایت صدیوں پر محیط ہے اور ہر دَور میں کچھ ایسے شعرا سامنے آئے جنہوں نے اپنے وقت کی نمائندگی کی، نئے رجحانات متعارف کرائے اور زبان و بیان کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ بیسویں صدی کے وسط سے لے کر اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک جو شاعری سامنے آئی، اسے ''جدید اُردو شاعری'' کہا جاتا ہے۔اس دَور کے شعرا نے روایتی اُسلوب سے ہٹ کر ایک نئے طرزِ احساس، نئے موضوعات اور نئی زبان کو فروغ دیا۔

ذیل میں جدید اُردو شاعری کے چند اہم غزل گو شعرا کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے:

﴿۱﴾ فانی بدایونی (پیدائش: ۱۸۷۹ء - وفات: ۲۷؍اگست ۱۹۴۱ء)

فانی اُردو کے عظیم اور دل گرفتہ لہجے کے معروف شاعر تھے۔اُن کا اصل نام محمد شوکت علی خان تھا اور فانی ان کا تخلص تھا۔ وہ اُردو غزل کو ایک خاص درد اور فلسفۂ فنا کے رنگ میں ڈھالنے کے لئے مشہور ہیں۔ فانی کی پیدائش ۱۸۷۹ء میں بریلی کے پاس شہر بدایوں میں ہوئی تھی۔ان کے والد کا نام محمد شجاعت علی خان تھا، جو برطانوی دور میں انسپکٹر پولیس کے عہدے پر فائز رہے۔ان کے والد نے بیٹے کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی۔ فانی نے ابتدائی تعلیم بدایوں میں حاصل کی، بریلی کالج سے بی.اے کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ مسلم

یونیورسٹی گئے۔ یہاں وہ سرسید احمد خان اوران کے تعلیمی مشن سے متاثر ہوئے۔ تاہم تعلیم مکمل کیے بغیر ہی انہوں نے کالج چھوڑ دیا اور عملی زندگی میں قدم رکھا۔ فانؔی کچھ عرصہ مختلف چھوٹی موٹی ملازمتوں میں رہے لیکن ان کی آزادطبعیت اور حساس مزاج نے کسی ایک جگہ نہیں رہنے دیا۔ زندگی کا بڑا حصہ کرب واضطراب میں گزرا۔ ۱۹۳۲ء میں وہ نواب مہدی نواز جنگ کی دعوت پر حیدرآباد(دکن) چلے گئے، جہاں انہیں کچھ مالی آسودگی ملی۔ یہیں ان کا بقیہ وقت گزرا اور وہیں ۲۷/اگست ۱۹۴۱ء کو انتقال کر گئے۔

فانؔی بدایونی اُردوغزل کے کلاسیکی مزاج کے آخری بڑے نمائندہ شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں یاسیت (اُداسی)، زندگی کی بے ثباتی اور موت کا فلسفہ غالب نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں غالبؔ اور میرؔ کی جھلک نمایاں ہے مگر ان کے طرزِ احساس نے انہیں الگ شناخت دی۔ وہ یگانؔہ چنگیزی اور جگر مرادآبادی کے ہم عصر تھے۔ فانؔی کی شاعری میں فنا اور عدم کا فلسفہ، محبت کی ناکامی، تنہائی کا احساس، زندگی کی بے ثباتی، وجودی کرب تھا۔ ان کی شاعری غزل کے دائرے میں محدود رہی مگر انہوں نے اس صنف میں وہ گہرائی پیدا کی جس نے انہیں لازوال کر دیا۔ فانؔی بدایونی کے مشہور اشعار ملاحظہ ہوں:

کسی کی یاد میں دنیا کو کیوں خراب کریں
کسی کے پیار میں کیوں خود کو بے حساب کریں

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانؔی
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

اُس کو بھولے تو ہوئے ہو فانؔی
کیا کروگے وہ اگر یاد آیا

ہم ہیں اس کے خیال کی تصویر
جس کی تصویر ہے خیال اپنا

رونے کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں فانیؔ
یہ اس کی گلی ہے ترا غم خانہ نہیں ہے

آتے ہیں عیادت کو تو کرتے ہیں نصیحت
احباب سے غم خوار ہوا بھی نہیں جاتا

﴿۲﴾ حسرتؔ موہانی (پیدائش: ۱۸۸۰ء-وفات: ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء)

حسرتؔ موہانی کا اصل نام سید فضل الحسن تھا اور تخلص حسرتؔ رکھتے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۸۰ء اور ان کا مقام پیدائش موہان، ضلع اناؤ، اتر پردیش تھا۔ حسرتؔ موہانی کا تعلق ایک معزز خاندان سے تھا۔ ان کے آباؤاجداد کا تعلق ساداتِ کرام سے تھا جو علمی و دینی اعتبار سے معروف تھے۔ حسرتؔ نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی قصبے موہان میں حاصل کی۔ بعدازاں انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ۱۹۰۳ء میں بی.اے کیا۔ وہ تعلیم کے دَوران ہی شاعری اور سیاسی شعور کی جانب مائل ہو چکے تھے۔

حسرتؔ موہانی اُردو کے ممتاز شاعر، ادیب، نقاد اور صحافی تھے۔ ان کا تخلص حسرتؔ تھا جو ان کی شاعری کی نمایاں پہچان بن گیا۔ ان کی شاعری میں عشقِ حقیقی اور مجازی دونوں کی جھلک موجود ہے۔ کلاسیکی روایت کے ساتھ ساتھ انقلابی جذبات بھی نظر آتے ہیں۔ انہوں نے غالبؔ، میرؔ اور حالیؔ کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ''دیوانِ حسرت'' میں ان کا کلام شائع ہوا جو اُردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔

آپ کی خدمات کے نمایاں پہلو: (۱) ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ حسرتؔ ہی کا دیا ہوا ہے۔ (۲) انہوں نے خلافت تحریک میں سرگرم کردار ادا کیا۔ (۳) انہوں نے جیل میں بھی قید کے دَوران ادب و مذہب سے تعلق نہیں توڑا اور رباعیاتِ حسرتؔ جیل سے ہی مرتب کیں۔

حسرتؔ موہانی ایک سادہ، متقی اور باکردار انسان تھے۔ وہ نماز، روزہ، حج جیسے فرائض کے سختی سے پابند تھے۔ سادگی کا یہ عالم تھا کہ ایک چادر، ایک لنگی اور ایک ٹوپی میں گزارا کرتے۔ وہ کئی بار حج بیت اللہ کی سعادت سے سرفراز ہوئے اور حجاز سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ حسرتؔ موہانی کا انتقال لکھنؤ میں ۱۳ رمئی ۱۹۵۱ء کو ہوا اور وہیں انہیں سپردخاک کیا گیا۔

حسرتؔ موہانی کے مشہور و معروف اشعار:

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

چوری چوری ہم سے تم آکر ملے تھے جس جگہ
مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

تیری محفل سے اٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال
دیکھتا تھا میں کہ تونے بھی اشارہ کر دیا

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

﴿۳﴾ اصغرؔ گونڈوی (پیدائش: یکم مارچ ۱۸۸۴ء-وفات: ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء)

اصغرؔ گونڈوی کا اصل نام اصغر حسین اور قلمی نام اصغرؔ گونڈوی تھا۔ آپ ۱؍مارچ ۱۸۸۴ء میں ضلع گونڈہ، اُتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ آپ کا انتقال ۳۰؍نومبر ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ اتر پردیش میں ہوا۔ والد مولوی تفضّل حسین قانون گو کے عہدے پر فائز تھے۔ اصغرؔ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی اور انہوں نے قرآن مجید، فارسی، اُردو اور ابتدائی عربی کی بھی تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول میں ۱۸۹۸ء میں داخلہ لیا اور اسی اسکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ رسمی تعلیم کا سلسلہ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا لیکن ذاتی مطالعہ اور فکری وسعت نے انہیں علم و ادب کی دنیا میں نمایاں مقام عطا کیا۔ انہوں نے اپنے ابتدائی کلام کی اصلاح منشی خلیل احمد وجدؔ بلگرامی سے لی۔ اس کے بعد منشی امیر اللہ تسلیم سے بھی مشورۂ سخن کیا اور کچھ وقت کے بعد یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا کیوں کہ ان کا کوئی اصل استاد نہیں تھا۔

اصغرؔ گونڈوی کا شمار اُردو کے نرم گو، سادہ بیان اور تصوفانہ طرزِ احساس رکھنے والے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ انہوں نے غزل، نظم، رباعی اور قطعات سبھی اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن ان کی اصل پہچان غزل گوئی ہے۔ ان کی شاعری میں روحانیت، انسانیت، رندی، عرفان، دردمندی اور اخلاقی درس نمایاں انداز میں جھلکتے ہیں۔ ان کے اشعار میں تصوّف کی لطافت اور محبت کا سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ وہ شاعری کو محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک اخلاقی و روحانی پیغام کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ ان کی شاعری میں سچائی، سادگی اور بے ساختگی ہے۔ اصغرؔ گونڈوی نے جو ادبی خدمات انجام دیں اُن میں لکھنؤ کے مشہور ادبی مجلّے ''زمانہ'' (کانپور) سے وابستہ رہے، جس کے مدیر دیا شنکر نسیم اور بعد میں منشی دیا نرائن نگم جیسے شخصیات تھے۔ اس رسالے کے ذریعے انہوں نے کئی نئے اور پرانے شعرا کی اصلاح بھی کی اور اُردو شاعری میں اصلاحِ زبان کی تحریک کو فروغ دیا۔

اصغرؔ گونڈوی کے کلام کو کئی بار مرتب کیا گیا۔ ان کے اہم مجموعوں میں شامل ان کا پہلا شعری مجموعہ ''نشاطِ روح'' جو دسمبر ۱۹۲۵ء میں اور ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''سرودِ زندگی'' جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ کلیاتِ اصغرؔ گونڈوی کی تو بہت سی جلدیں شائع ہوئیں جن میں اصغرؔ کا سارا کلام محفوظ ہے۔ کئی اہم محققین نے ان کے کلام پر تفصیلی مضامین اور تنقیدی مقالے بھی لکھے ہیں۔ اصغرؔ گونڈوی نہایت سنجیدہ، سادہ مزاج اور گوشہ نشین شخصیت کے حامل تھے۔ دنیاوی لذتوں سے دُور، تصوّفانہ اندازِ فکر رکھنے والے انسان تھے۔ آپ نے کبھی شہرت کی پروا نہ کی۔ ان کی

محفلیں علم و فکر سے معمور ہوتیں مگر خودنمائی سے خالی۔ اصغؔر کے کلام میں خاص طور پر تصوّف و روحانیت، انسان دوستی، اخلاقیات، دنیا کی بے ثباتی، عشقِ حقیقی، دردمندی اور سماجی شعور جیسے موضوعات نمایاں نظر آتے ہیں۔ اصغؔر گونڈوی کے چند مشہور اشعار ملاحظہ ہوں:

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

پہلی نظر بھی آپ کی اُف کس بلا کی تھی
ہم آج تک وہ چوٹ ہیں دل پر لیے ہوئے

اس جوئے بارِ حُسن سے سیراب ہے فضا
روکو نہ اپنی لغزشِ مستانہ وار کو

تھیں نگاہِ شوق کی رنگینیاں چھائی ہوئی
پردۂ محمل اٹھا تو صاحبِ محمل نہ تھا

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

ایک ایسی بھی تجلی آج مے خانے میں ہے
لطف پینے میں نہیں ہے بلکہ کھو جانے میں ہے

جینا بھی آ گیا مجھے مرنا بھی آ گیا
پہچاننے لگا ہوں تمہاری نظر کو میں

﴿۴﴾ یگانؔہ چنگیزی (پیدائش: ۱۷/اکتوبر ۱۸۸۴ء-وفات: ۱۹۵۶ء)

یگانؔہ چنگیزی کا اصل نام مرزا واجد حسین تھا۔ وہ اپنی ابتدائی شاعری میں یاسؔ تخلص استعمال کرتے تھے اور اس کے بعد انہوں نے یگانؔہ تخلص اختیار کیا اور وہ یگانؔہ کے نام سے اُردو ادب میں مشہور ہوئے۔ یگانؔہ کی ولادت ۱۷/اکتوبر ۱۸۸۴ء میں پٹنہ، بہار کے محلّہ مغل پورہ میں ہوئی۔ لکھنؤ میں ۱۹۵۶ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اُردو شاعری کی تاریخ میں جن چند شعرا نے اپنے منفرد لہجے، فکری انفرادیت اور غیر مقلدانہ طرزِ اظہار سے اپنی پہچان قائم کی، ان میں مرزا واجد حسین یگانہ چنگیزی کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف ایک غیر روایتی شاعر تھے بلکہ اُردو ادب میں خودداری، انا پرستی، شعور کی بیداری اور فکری جرأت کے علَم بردار بھی تھے۔ ان کی شاعری میں جہاں داخلی اضطراب کی گونج ہے، وہیں معاشرتی تضادات اور ادبی روایت سے بغاوت کی چیخ بھی سنائی دیتی ہے۔ یگانہ کی شاعری میں لکھنؤ کی تہذیب کا عکس صاف طور پر نظر آتا ہے کیوں کہ انہوں نے اپنی زندگی کا کافی وقت لکھنؤ کی ادبی خدمات میں گزارا۔ ان کی دوستی بہت سے شعرا (عزیز، شفی، ثاقب اور محشر وغیرہ) سے ہو گئی جن کے ساتھ وہ اکثر مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے اور اپنی شاعری سے لوگوں کا دل جیت لیا کرتے تھے۔ انہیں کے ایک دوست (عزیز) جن کا ذکر ابھی اُوپر کیا تھا ان کی سرپرستی میں ایک رسالہ ''معیار'' جاری کیا اور اسی نام سے ایک پارٹی بھی قائم کی گئی۔ یگانہ بھی اس پارٹی کے زیر اہتمام مرزا غالب کی غزلوں کی زمینوں میں اپنی غزلیں کہہ کر پڑھنے لگے اور یہی وجہ تھی کہ مشاعروں کی جتنی غزلیں ''معیار'' میں شائع ہوئیں ان میں یگانہ کی بھی غزلیں شامل ہیں۔ یگانہ کی شہرت کا ڈنکا پورے لکھنؤ میں بجنے لگا۔ شعرا کو یہ برداشت نہیں ہوا اور ان کی مخالفت میں اتر گئے۔ خاص طور پر وہی لوگ جو کبھی ان کے عزیز دوست ہوا کرتے تھے۔

اسی واقعہ کو مدنظر رکھتے ہوئے (یگانہ کی زبانی) مالک رام جی تحریر رقم کرتے ہیں کہ:

> ''اب اس میں میرا کیا قصور! یہ خدا کی دین ہے۔ میرا کلام پسند کیا جانے لگا۔ باہر کے مشاعروں میں بھی جانا پڑتا۔ میری یہ ہر دل عزیزی اور مقبولیت ان لوگوں سے دیکھی نہ گئی۔''

لوگوں سے یگانہ کی شہرت برداشت نہیں ہوئی اور طرح طرح کے الزامات لگانا شروع کر دیے۔ حد تو تب ہوئی جب ان لوگوں نے یگانہ پر یہ بہتان لگایا کہ یہ غالب کے شدید مخالف ہیں۔ کیوں کہ لکھنؤ والے غالب کو بے حد چاہتے تھے لیکن یگانہ کو غالب کا اندھا مخالف نہیں کہا جا سکتا۔ مالک رام اپنے مضمون میں مزید لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ یگانہ نے خد کہا تھا کہ:

> ''یہ کس نے آپ کو بہکا دیا کہ میں غالب کا مخالف ہوں، وہ یقیناً بہت بڑا شاعر ہے۔ صاحب! غالب کی صحیح قدر و منزلت مجھ سے زیادہ کون سمجھے گا، مجھے غصہ اس بات پر آتا ہے کہ لوگ اس کے جائز سے زیادہ اس کو دینا چاہتے ہیں اور پھر ستم یہ ہے کہ یہ بھی وہ لوگ نہیں، جو اس کا صحیح مقام سمجھتے ہوں بلکہ وہ جو تقلیداً اسے بڑا سمجھتے ہیں......تو صاحب! میں غالب کے خلاف نہیں تھا اور نہ ہوں گا لیکن میں اس کی جائز جگہ سے زیادہ اس کے حوالے کر دینے پر تیار نہیں۔''

(مضمون از۔ مالک رام)

یاس یگانہ چنگیزی کے مشہور اشعار ملاحظہ ہوں:

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

شربت کا گھونٹ جان کے پیتا ہوں خونِ دل
غم کھاتے کھاتے منہ کا مزہ تک بگڑ گیا

واعظ کی آنکھیں کھل گئیں پیتے ہی ساقیا
یہ جامِ مے تھا یا کوئی دریائے نور تھا

دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجیے

☆☆☆

کیوں کسی سے وفا کرے کوئی دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی
درد ہو تو دوا بھی ممکن ہے وہم کی کیا دوا کرے کوئی

کششِ لکھنؤ ارے توبہ پھر وہی ہم وہی امین آباد

(۴) جگرمرادآبادی (پیدائش:۱۸۹۰ء-وفات:۱۹۶۰ء)

جگرؔمرادآبادی کا اصل نام علی سکندر تھا۔ان کی ولادت ۱۸۹۰ء میں بنارس،اتر پردیش میں ایک علمی وادبی گھرانے میں ہوئی۔جب اُردوشاعری کے آسمان پر رعنائی،سوز اور خلوص کے ستارے جگمگاتے ہیں تو ان میں ایک نام اپنی الگ روشنی کے ساتھ چمکتا ہے اور وہ نام ہے جگرمرادآبادی کا ہے۔

جگرؔ نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی اور وہ اسی کے ہوکر رہ گئے۔ان کی ابتدائی شاعری میں داغؔ دہلوی کے دبستان کا رنگ تھا لیکن جلد ہی انہوں نے اپنا منفرد اسلوب پیدا کرلیا۔جگرؔ کی شاعری وہ خم ہے جو جام سے پہلے نشہ طاری کردے،وہ صدا ہے جو دل کے ویران گوشوں کو آباد کردے اور وہ زخم ہے جس میں مرہم بھی پوشیدہ ہوجائے۔ان کی غزلوں میں عشق،خلوص،شراب،زندگی کی تلخیوں اور روحانیت کا

امتزاج ملتا ہے۔ وہ ایسے شاعر تھے جو مے خانے کو خانقاہ بنا دیتے تھے اور پیالے کو محراب۔ جگر کی ذات میں بیک وقت ایک صوفی کا سوز اور ایک رِند کا جلال پایا جاتا ہے۔ انہوں نے شراب کو صرف نشہ نہیں بلکہ علامت کے طور پر برتا۔ کبھی ہجر کی راتوں کی تلخی کے لئے، کبھی جذبِ دروں کی بے قراری کے لئے اور کبھی اس دنیا کی بے ثباتی پر طنز کے لئے۔ جگر کی شاعری ایک وجدانی تجربہ ہے۔ جگر کی شاعری صرف غزل نہیں بلکہ ایک داخلی تجربہ ہے، ایک ایسا جذبہ جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

جگر کے چند لازوال اشعار:

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ
میں اپنا جام اٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اک لفظ محبت کا ادنیٰ یہ فسانہ ہے
سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

ہائے رے مجبوریاں محرومیاں ناکامیاں
عشق آخر عشق ہے تم کیا کرو ہم کیا کریں

طولِ غمِ حیات ہے گھبرا نہ اے جگر
ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہ ہو

ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگِ محفل
کسے دیکھ کر آپ شرمایئے گا

ابتدا وہ تھی کہ جینا تھا محبت میں محال
انتہا یہ ہے کہ اب مرنا بھی مشکل ہو گیا

دونوں ہاتھوں سے لوٹتی ہے ہمیں
انتہا یہ ہے کہ اب مرنا بھی مشکل ہو گیا

جگرؔ کے ان اشعار میں محبت کا خلوص، ہجر کا درد اور روحانیت کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ جگرؔ کو اُن کے دَور میں غزل کا شہنشاہ کہا گیا۔ ان کی شاعری نے فراقؔ، حسرتؔ، اصغرؔ اور جوشؔ جیسے ہم عصر شعرا کو بھی متاثر کیا۔ ان کی غزلوں میں یہاں کی تہذیب، رومانی جذبات اور روحانی اسرار کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ جگرؔ کی ذاتی زندگی میں دکھ، تنہائی اور شکست کا رنگ گہرا رہا۔ انہوں نے زندگی میں بہت سے صدمے سہے مگر ہمیشہ تبسم کے ساتھ جیے۔ جگرؔ مرادآبادی کا انتقال ۱۹۶۰ء میں ہوا۔ ان کا جسد خاکی تو مٹی میں جا سویا لیکن ان کی غزلوں کا ترنم آج بھی زندہ ہے۔

ذیل میں جدید اُردو شاعری کے چند اہم نظم گو شعرا کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے:

﴿۱﴾ فیض احمد فیضؔ (پیدائش: ۱۳ر فروری ۱۹۱۱ء - وفات: ۲۰ر نومبر ۱۹۸۴ء)

فیض احمد فیضؔ بیسویں صدی کی اُردو شاعری کا ایک روشن ستارہ ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے نہ صرف اُردو ادب کو نیا رخ دیا بلکہ ظلم، جبر، آمریت، غربت اور استحصال کے خلاف ایک پراثر آواز بھی اٹھائی۔ فیضؔ کی ولادت ۱۳ر فروری ۱۹۱۱ء میں سیال کوٹ کے ایک چھوٹے سے کالاقدار کے علمی گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سلطان محمد تھا۔ فیضؔ اپنی شاعری کو صرف جذباتی اظہار کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ اُسے ایک انقلابی ہتھیار بناتے ہیں۔ فیضؔ کی شاعری میں عشق اور انقلاب کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے جو اُردو شاعری میں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں عشق کا رنگ غالب ہے لیکن جیسے جیسے زمانے نے کروٹ لی اور سماجی حالات بدلنے لگے ویسے ویسے ان کی شاعری میں عوامی درد اور سیاسی شعور کی جھلک بھی شامل ہوتی گئی۔ ان کے ہاں محبوب کی آنکھوں سے لے کر مزدور کے پسینے تک سب کچھ شعری موضوع بن جاتا ہے۔ فیضؔ کا اسلوب نہایت لطیف، شیریں اور بلیغ ہے۔ وہ عام فہم زبان میں عمیق ترین خیالات بیان کرنے کا فن جانتے ہیں ان کی شاعری میں فارسی، عربی اور اُردو کے روایتی الفاظ کا خوب صورت امتزاج ملتا ہے مگر کبھی ثقالت پیدا نہیں ہوتی۔ ان کی زبان دل میں اترنے والی، لہجہ نرم اور تخیل بلند ہے۔ وہ نظم اور غزل دونوں پر عبور رکھتے ہیں۔ فیض کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ وہ عشق کی زبان میں انقلاب کی بات کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے یہ اشعار دیکھیے:

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

یا

گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

مذکورہ اشعار میں ایک طرف جمالیاتی حُسن ہے تو دوسری طرف امید، جدوجہد اور بیداری کا پیغام۔فیضؔ ترقی پسند تحریک کے اہم رہنما تھے۔ان کی شاعری میں مارکسزم، سماجی مساوات اور جبر کے خلاف احتجاج صاف نظر آتا ہے لیکن وہ سخت زبان استعمال نہیں کرتے بلکہ ایک شاعر کی لطافت سے احتجاج کرتے ہیں۔وہ قید و بند کی صعوبتیں سہتے ہیں لیکن ان کے الفاظ میں تلخی نہیں بلکہ عزم اور وقار ہوتا ہے۔محبت فیضؔ کی شاعری کا بنیادی عنصر ہے لیکن وہ عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی اور پھر عشقِ عوام تک پہنچتے ہیں۔ان کے یہاں محبوب کبھی وطن ہے، کبھی نظریہ اور کبھی مزدور۔وہ محبت کو کائناتی وسیلہ مانتے ہیں جو انسان کو انسان سے جوڑتا ہے۔فیضؔ کی زبان میں روایت کا حسن اور جدت کی تازگی دونوں شامل ہیں۔وہ کلاسیکی استعاروں کو جدید شعور کے ساتھ جوڑنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ان کی شاعری میں تصوّف، رومان، انقلابی فکر اور تہذیبی وقار سب کچھ موجود ہے۔ان کی وفات ۲۰ر نومبر ۱۹۸۴ء) میں لاہور میں ہوئی اور وہ اس دَورفانی کو الوداع کہہ گئے۔

فیض احمد فیضؔ کی مشہور شاعری:

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے

یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بنوائے ہوئے

جا بہ جا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

☆☆☆

دل ناامید تو نہیں نا کام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب — آج تم یاد بے حساب آئے
اور کیا دیکھنے کو باقی ہے — آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا

﴿۲﴾ اسرارالحق مجازؔ (پیدائش:۱۹/اکتوبر ۱۹۱۱ء-وفات:۵/دسمبر ۱۹۵۵ء)

اُردو نظم کا ایک ایسا شاعر جس نے اپنی شاعری سے پورے اُردو ادب میں ایک ہل چل مچا دی۔اس عظیم شاعر کا نام اسرارالحق مجاز ہے۔ان کی ولادت سن ۱۹/اکتوبر ۱۹۱۱ء میں بارہ بنکی کے مشہور قصبے رُدولی میں ہوئی۔والد گرامی کا نام چودھری سراج الحق تھا جو اتر پردیش کی راجدھانی لکھنؤ میں محکمۂ رجسٹریشن میں ہیڈ کلرک کے عہدے پر فائز تھے۔

اسرار الحق مجازؔ اُردو ادب کے انقلابی اور رومانوی شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک کے اہم ستون تھے جن کی شاعری میں جذباتی گہرائی، انقلابی ولولہ، رومان پرور کیفیت اور سماجی شعور کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ مجازؔ کی شاعری میں حُسن، عشق، محبوبہ، تنہائی اور آرزوؤں کی ایک دلکش فضا نظر آتی ہے۔ ان کی رومانویت محض جذباتی نہیں بلکہ فکری اور تہذیبی تناظر میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مجازؔ ایک سماجی شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں مزدور، کسان، عورت، ظلم واستبداد اور طبقاتی نظام کے خلاف آواز موجود ہے۔ ان کے اشعار عوامی جوش وجذبہ پیدا کرتے ہیں۔ مجازؔ نے ترقی پسند تحریک کے منشور کو اپنی شاعری میں خوب صورتی سے سمویا۔ ان کے یہاں ادب برائے زندگی کا تصور بہت نمایاں ہے۔ مجازؔ کی شاعری میں جدید شہری تہذیب کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ لکھنوی تہذیب کی نزاکت اور دہلوی فکر کا امتزاج اُن کے اُسلوب کو منفرد بناتا ہے۔ مجازؔ نے عورت کو صرف محبوبہ کی حیثیت سے نہیں دیکھا بلکہ اُس کی سماجی حیثیت، درد اور جدوجہد کو بھی شعری جامہ پہنایا۔ ان کا یہ شعر اس بات کی گواہی دیتا ہے:

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

مجازؔ کے اشعار میں ایک خاص ترنم اور نغمگی ہے جو ان کے کلام کو گانے اور سننے کے قابل بناتی ہے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں دونوں میں موسیقیت نمایاں ہے۔ ان کے کلام میں زبان کی شستگی، محاورے کا برمحل استعمال اور بیان کی شائستگی نے اُن کے اسلوب کو پختہ اور دلکش بنا دیا۔ مجازؔ کی شاعری میں عشق، انقلاب، جمال، کرب اور اُمید کا حسین امتزاج ہے۔ وہ ایک ایسا شاعر ہے جس نے دل کی بھی بات کی اور زمانے کی بھی۔ جو خواب بھی دیکھتا ہے اور حقیقت کو بھی بیان کرتا ہے۔ ان کی شاعری آج بھی نوجوانوں کے دلوں میں ولولہ پیدا کرتی ہے اور فکری طور پر جھنجوڑتی ہے۔ مجازؔ کی نمائندہ شاعری کی چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

دفن کر سکتا ہوں سینے میں تمہارے راز کو
اور تم چاہو تو افسانہ بنا سکتا ہوں میں

یہ میرے عشق کی مجبوریاں معاذ اللہ
تمہارا راز تمہیں سے چھپا رہا ہوں میں

عشق کا ذوق نظارہ مفت میں بدنام ہے
حسن خود بے تاب ہے جلوہ دکھانے کے لئے

روئیں نہ ابھی اہلِ نظر حال پہ میرے
ہونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ

نظم آوارہ کے کچھ بند ملاحظہ کیجیے:

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارا پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بہ در مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

☆

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر رکھی ہوئی شمشیر سی
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

☆

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

☆

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

﴿۳﴾ اختر الایمان (پیدائش: ۱۲/نومبر ۱۹۱۵ء- وفات: ۱۹۵۵ء)

اختر الایمان اُردو شاعری کے جدید لب و لہجے کے ایک نمایاں شاعر تھے جنہوں نے اُردو نظم کو ایک نئی معنویت بخشی۔ ان کی ولادت ۱۲/نومبر ۱۹۱۵ء میں ضلع بجنور کے ایک قصبے نجیب آباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ بعدازاں وہ فلمی دنیا سے بھی وابستہ ہو گئے اور کئی فلموں کے مکالمے اور نغمے بھی لکھے، جن میں ان کی شاعرانہ خصوصیت جھلکتی ہے۔

اختر الایمان کی شاعری میں داخلیت، فکر و فلسفہ، اور زندگی کے گہرے مشاہدات ملتے ہیں۔ ان کی مشہور نظموں اور شعری مجموعوں میں ''گرداب''، ''یادیں'' اور ''بنتِ لمحات'' شامل ہیں۔ انہوں نے اُردو نظم کو نیا شعور دیا اور روایت سے بغاوت کرتے ہوئے جدید موضوعات کو

پیش کیا۔ ان کی وفات ۱۹۵۵ء میں ہوئی۔ ان کا ادبی ورثہ آج بھی اُردو ادب کے سنجیدہ قارئین کو متاثر کرتا ہے۔ اختر الایمان اُردو نظم کے ان چند شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے نہ صرف اس صنف کو سنوارا بلکہ اسے ایک فکری جہت بھی عطا کی۔

اختر الایمان کی شاعری اُردو نظم کے ارتقا میں ایک نمایاں اور انفرادی مقام رکھتی ہے۔ اختر الایمان کی شاعری میں ذات کے گہرے تجربات، احساسِ تنہائی اور انسان کی باطنی کشمکش کو بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ ''زندگی ایک خواب ہے یا حقیقت؟'' اس سوال کے ساتھ وہ اکثر قاری کو اپنے وجود کی گہرائی میں لے جاتے ہیں۔ انہوں نے نثری نظم کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی نظمیں پلاٹ، کردار اور مکالمے کے عناصر سے مزین ہوتی ہیں، جیسے کہ ایک مختصر افسانہ ہو۔ اختر الایمان کی شاعری میں اکثر ایک گہرا دکھ، بے بسی اور زندگی کی معنویت کا احساس ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں علامتی انداز نمایاں ہے۔ وہ سیدھی بات کرنے کے بجائے اشیا اور فضا کے ذریعے جذبات و خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اختر الایمان کے موضوعات میں فرد، وقت، تنہائی، موت، زندگی، سماج، سیاست اور مذہب جیسے موضوعات شامل ہیں لیکن وہ ہمیشہ ان موضوعات کو ذاتی تجربے کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں ایک گہری فکری سنجیدگی اور وجودی فلسفہ پایا جاتا ہے۔ وہ سادہ سوالوں سے پیچیدہ معنوی پرتیں کھولتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ مگر پُر اثر ہوتی ہے۔ وہ ثقیل الفاظ سے گریز کرتے ہیں اور زیادہ تر سلیس زبان میں عمیق جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اختر الایمان کی شاعری جذبے کی شدت، علامت نگاری، وجودی فکر اور ادبی نثر نما نظموں کا حسین امتزاج ہے۔ وہ نہ صرف اردو نظم کے معماروں میں شامل ہیں بلکہ انہوں نے اردو شاعری کو ایک نیا فکری اور اسلوبیاتی زاویہ دیا۔ ان کی مشہور نظموں کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

نظم ''آخری ملاقات'':

آؤ کہ جشن مرگ محبت منائیں ہم!
آتی نہیں کہیں سے دل زندہ کی صدا
سونے پڑے ہیں کوچہ و بازار عشق کے
ہے شمع انجمن کا نیا حسن جاں گداز
شاید نہیں رہے وہ پتنگوں کے ولولے
تازہ نہ رہ سکیں گی روایات دشت و در
وہ فتنہ سر گئے جنہیں کانٹے عزیز تھے
اب کچھ نہیں تو نیند سے آنکھیں جلائیں ہم
آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت منائیں ہم!

☆☆☆

سوچا نہ تھا کہ آئے گا یہ دن بھی پھر کبھی
اک بار پھر ملے ہیں ، ذرا مسکرا تو لیں!

کیا جانے اب نہ الفت دیرینہ یاد آئے
اس حُسن اختیار پہ آنکھیں جھکا تو لیں
برسا لبوں سے پھول تری عمر ہو دراز
سنبھلے ہوئے تو ہیں پہ ذرا ڈگمگا تو لیں
اور اپنا اپنا عہد وفا بھول جائیں ہم
آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت منائیں ہم!

نظم ''بنت لمحات''

تمہارے لہجے میں جو گرمی و حلاوت ہے
اسے بھلا سا کوئی نام دو وفا کی جگہ
غنیم نور کا حملہ کہو اندھیروں پر
دیار درد میں آمد کہو مسیحا کی
رواں دواں ہوئے خوشبو کے قافلے ہر سو
خلائے صبح میں گونجی سحر کی شہنائی
یہ ایک کہرا سا ، یہ دھند سی جو چھائی ہے
اس التہاب میں ، اس سرمگیں اجالے میں
سوا تمہارے مجھے کچھ نظر نہیں آتا
حیات نام ہے یادوں کا ، تلخ اور شیریں
بھلا کسی نے کبھی رنگ و بو کو پکڑا ہے
شفق کو قید میں رکھا صبا کو بند کیا
ہر ایک لمحہ گریزاں ہے ، جیسے دشمن ہے
نہ تم ملو گی نہ میں ، ہم بھی دونوں لمحے ہیں
وہ لمحے جا کے جو واپس کبھی نہیں آتے!

﴿۴﴾ ساحرلدھیانوی (پیدائش:۸/مارچ ۱۹۲۱ء- وفات:۲۵/اکتوبر ۱۹۸۰ء)

ساحرلدھیانوی اُردواور ہندی کے ممتاز شاعر، نغمہ نگار اور انقلابی فکر کے علم بردار تھے۔ان کا اصل نام عبدالحئ تھا لیکن ادبی دنیا میں وہ ساحرلدھیانوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ان کی ولادت ۸/ مارچ ۱۹۲۱ء میں لدھیانہ میں ہوئی۔بچپن ہی سے ادبی ذوق رکھتے تھے اور نو جوانی میں ہی شاعری شروع کردی۔ساحر کی شاعری میں محبت، سماجی ناانصافی، غربت، طبقاتی کشمکش اور انسان دوستی کے موضوعات نمایاں ہیں۔ان

کا پہلا شعری مجموعہ ''تلخیاں'' بہت مقبول ہوا اور آج بھی اُردو ادب کا اہم حوالہ ہے۔ فلمی دنیا میں انہوں نے نغمہ نگار کی حیثیت سے الگ پہچان بنائی۔ ان کے لکھے ہوئے گیت آج بھی زبان زدِ عام ہیں، جن میں جذبات، احتجاج اور فکر کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ اس عظیم شاعر کی وفات ۲۵/اکتوبر ۱۹۸۰ء میں دل کا دَورہ پڑنے سے ہوئی۔ ساحرؔ لدھیانوی کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے اُردو شاعری کو عوامی سطح پر مقبولیت دی اور اپنے خیالات کے ذریعے ایک نسل کو متاثر کیا۔ ان کی خاص نظموں کے اشعار مثال کے طور پر ملاحظہ کیجیے:

(نظم کبھی کبھی):

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ زندگی تری زلفوں کی نرم چھاؤں میں
گزرنے پاتی تو شاداب ہو بھی سکتی تھی
یہ تیرگی جو مری زیست کا مقدّر ہے
تری نظر کی شعاعوں میں کھو بھی سکتی تھی
عجب نہ تھا کہ میں بیگانۂ اَلَم ہو کر
ترے جمال کی رعنائیوں میں کھو رہتا
ترا گداز بدن تیری نیم باز آنکھیں
انہی حسین فسانوں میں محو ہو رہتا

(نظم تاج محل):

تاج تیرے لیے اک مظہر الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادیِ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے
بزم شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی
ثبت جس راہ میں ہوں سطوت شاہی کے نشاں
اس پہ الفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی
میری محبوب پس پردہ تشہیر وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا

ان گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے
لیکن ان کے لئے تشہیر کا سامان نہیں
کیوں کہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے

﴿۴﴾ ن.م راشد(پیدائش:۱/اگست ۱۹۱۰ء-وفات:۹/اکتوبر ۱۹۷۵ء)

ن.م راشد جدید اُردو نظم کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں، انہوں نے شاعری کو روایت سے نکال کر جدید فکر، علامت اور تجربے کی راہ پر ڈالا۔ ان کا پورا نام نذر محمد راشد تھا۔ ان کی ولادت ۱/اگست ۱۹۱۰ء میں علی پور چٹھہ ضلع گوجرانوالہ میں ہوئی۔ ان کی انتقال ۹/اکتوبر ۱۹۷۵ء میں لندن، برطانیہ میں ہوئی اور وہیں دفن ہوئے۔ ن.م راشد نے اُردو میں آزاد نظم کو فنی اور فکری طور پر مقبول کیا۔ ان کی شاعری میں فلسفیانہ فکر، وجودیت، داخلی کشمکش اور خودی جیسے پیچیدہ موضوعات ملتے ہیں۔ راشد نے علامتوں اور استعاروں سے شاعری کو ایک نئی جمالیات دی۔ ان کے یہاں فرد کی آزادی، شخصیت کی تلاش اور معاشرتی جبر کے خلاف آواز پائی جاتی ہے۔ زبان و بیان میں جدت، جدید تراکیب، نیا لہجہ اور فکری تہہ داری ان کا امتیاز ہے۔ ان کے اہم شعری مجموعے ''ماورا''، ''ایران میں اجنبی''، ''لا انسان اور ''گماں کا ممکن'' ہیں۔ ن.م راشد نے اُردو شاعری کو ایک نئے فکری اُفق سے روشناس کرایا۔ ان کی نمائندہ نظم کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

نظم ''حسن کوزہ گر'':

جہاں زاد نیچے گلی میں ترے دَر کے آگے
یہ میں سوختہ سر حسن کوزہ گر ہوں!
تجھے صبح بازار میں بوڑھے عطار یوسف
کی دکان پر میں نے دیکھا
تو تیری نگاہوں میں وہ تابنا کی
تھی میں جس کی حسرت میں نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں
جہاں زاد نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں!
یہ وہ دَور تھا جس میں مَیں نے
کبھی اپنے رنجور کوزوں کی جانب
پلٹ کر نہ دیکھا
وہ کوزے مرے دست چابک کے پتلے
گل و رنگ و روغن کی مخلوق بے جاں
وہ سر گوشیوں میں یہ کہتے
حسن کوزہ گر اب کہاں ہے؟

نظم ''انتقام'':

اس کا چہرہ، اس کے خد و خال یاد آتے نہیں
اک شبستاں یاد ہے
اک برہنہ جسم آتشداں کے پاس
فرش پر قالین، قالینوں پہ سیج
دھات اور پتھر کے بت
گوشۂ دیوار میں ہنستے ہوئے!
اور آتشداں میں انگاروں کا شور
ان بتوں کی بے حسی پر خشمگیں
اُجلی اُجلی اونچی دیواروں پہ عکس
ان فرنگی حاکموں کی یادگار
جن کی تلواروں نے رکھا تھا یہاں
سنگ بنیاد فرنگ!

جدید اُردو شاعری ایک متنوع اور ہمہ گیر تحریک ہے، جس میں روایت سے بغاوت بھی ہے اور اسے نئے انداز میں اپنانا بھی۔ ان شعرا نے اپنی داخلی اور خارجی دنیا کو جس طرح نظم کیا، اس سے اُردو شاعری کو ایک نئی روح ملی۔ یہ شاعری صرف جمالیات کا اظہار نہیں بلکہ فکر، سوال، احتجاج اور انسان دوستی کا استعارہ ہے۔

06.07 خلاصہ

جدید اُردو شاعری صرف اسلوب کی تبدیلی کا نام نہیں بلکہ شعور کی بیداری، احساس کی گہرائی اور اظہار کی نئی جہتوں کا سفر ہے۔ یہ شاعری ان رسمی پابندیوں کو توڑتی ہے جن میں جذبہ، خیال اور زبان ایک خاص سانچے میں جکڑے ہوئے تھے۔ جدید شعرا نے خارجی دنیا کے بجائے اپنے اندر کی دنیا کو موضوع بنایا۔ یہاں شعرا فرد کی تنہائی، وجود کی بے معنویت اور وقت کی بیرحمی سے مکالمہ کرتے ہیں۔ روایتی تشبیہات و استعارات کی جگہ، نئے علامتی نظام نے لے لی۔ شاعری میں فلسفہ، نفسیات اور وجودیت جیسے نظریات کی آمیزش نظر آتی ہے۔ نظم محض شاعری نہیں، ایک فکری کائنات کا دَر کھولتی ہے۔ جدید اُردو شاعری وہ تخلیقی ردِعمل ہے جو بدلتے ہوئے سماجی، فکری اور تہذیبی منظرنامے کے تحت وجود میں آیا۔ اس شاعری نے روایت کی باندھی ہوئی گرہوں کو کھولا، جذبات کو ذاتی تجربے سے جوڑا اور الفاظ کو محض اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک شعوری عمل بنا دیا۔ یہ شاعری ایک ایسے انسان کی آواز ہے جو صنعتی زندگی، تنہائی، شناخت کے بحران اور وجودی کرب سے دوچار ہے۔ یہاں محبوب محض ایک رومانوی تصوّر نہیں بلکہ ایک علامت ہے۔ شاعر اب معاشرے سے ہٹ کر اپنے اندر کے تاریک گوشوں کی بات کرتا ہے اور

اس کے اندر داخلیت کا غلبہ طاری ہے۔مفہوم براہِ راست نہیں بلکہ اشاروں، استعاروں اور علامتوں میں بیان ہوتا ہے۔انسان، وقت، موت، تنہائی اور تقدیر جیسے موضوعات پر گہرے فکری مکالمے پیش کیے گئے۔جدید اُردو شاعری محض اشعار کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک بیدار ذہن کا بیانیہ ہے۔جو ماضی سے سبق لے کر حال سے مکالمہ کرتا ہے اور مستقبل کی طرف ایک فکری چراغ ہاتھ میں تھامے بڑھتا ہے۔

فانیؔ، حسرتؔ، جگرؔ، اصغرؔ، اور یگانہؔ جدید اُردو غزل کے وہ درخشاں ستارے ہیں جنہوں نے غزل کو ایک نئے ذوق، نئی زبان اور نئے فکری رجحانات سے آشنا کیا۔اُردو غزل کو کلاسیکی روایت سے نکال کر جدید احساسات، داخلی کشمکش اور عصری شعور سے روشناس کرانے میں جن شعرا کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اُن میں فانیؔ بدایونی، حسرتؔ موہانی، جگرؔ مرادآبادی، اصغرؔ گونڈوی اور یگانہؔ چنگیزی نمایاں نام ہیں۔

حسرتؔ موہانی نے غزل کو آزادیِ فکر، سادگی اور متانت کا جو رنگ ملا، وہ بڑی حد تک حسرتؔ موہانی کی دین ہے۔اُن کی شاعری میں کلاسیکی جمالیات کے ساتھ ساتھ قومی جذبات اور شخصی صداقت بھی نظر آتی ہے۔وہ محبت، سیاست اور سچائی کو یکجا کرنے والے منفرد شاعر تھے۔جگرؔ مرادآبادی: جگرؔ نے اُردو غزل کو شراب و شباب کی رومانیت سے نکال کر عشق کی تطہیر اور روحانی تجربے سے گزارا۔ان کی شاعری میں عاشق کی اَنا، شکستِ دل اور عارفانہ حُزن کی جھلک ملتی ہے۔ان کا اسلوب پُراثر، مترنم اور وجدآور تھا۔اصغرؔ گونڈوی اصغرؔ نے غزل میں خانقاہی طہارت اور اخلاقی شعور کو شامل کیا۔ان کی زبان نرم، شستہ اور سادہ تھی۔وہ صوفیانہ فکر کے ساتھ روزمرّہ انسانی جذبات کو بھی خوب صورتی سے بیان کرتے ہیں۔یگانہؔ چنگیزی: یگانہؔ ایک باغی اور منفرد آواز کے طور پر اُبھرے۔انہوں نے روایتی غزل کی ساخت، موضوعات اور الفاظ پر سوال اٹھائے اور غزل کو خودداری، فکری بیباکی اور فلسفیانہ گہرائی عطا کی۔ان کی زبان میں طنز، شوخی اور ایک خاص طرح کی ذہنی برہمی پائی جاتی ہے۔یہ تمام شعرا اپنی انفرادی خصوصیات کے باوجود ایک مشترکہ فکری دھارے سے جُڑے ہوئے ہیں۔جدید انسان کی اُلجھنیں، محبت کی نفسیاتی گہرائیاں اور فکری خودمختاری۔ان شعرا نے اُردو غزل کو محض تغزل نہیں رہنے دیا بلکہ اسے سوچنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کی زبان بنا دیا۔

فیض احمد فیضؔ، اسرارالحق مجازؔ، اخترالایمان، ن.م. راشد جیسے شعرا نے نظم کو نہ صرف نئی پہچان دی بلکہ اسے زندگی کے گہرے سوالات کا آئینہ بھی بنایا۔شاعری اب صرف محبوب کے حسن و وصال تک محدود نہ رہی۔شہر، ٹریفک، فیکٹری، سیاست، جنگ، ظلم اور محرومیاں بھی اس کے موضوعات بنے۔جدید اُردو شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں نہ صرف زمانہ بلکہ خود شاعر کا چہرہ بھی صاف نظر آتا ہے۔یہ شاعری نہ صرف نئی زبان میں بات کرتی ہے بلکہ نئے دل، نئے ذہن اور نئے خوابوں کی نمائندہ بھی ہے۔

06.08 فرہنگ

آمریت	:	شخصی حکومت	عبور	:	مہارت، پار کرنا
آمیزش	:	میل جول، شمولیت	عیادت	:	بیمار کی خبر لینا
استغنا	:	بے نیازی، بے پرواہی، بے رخی	فارغ التحصیل	:	سند یافتہ، حصول تعلیم یا تربیت سے فارغ
اضطراب	:	بے چینی، بے قراری	فلاح	:	کامیابی، سرفرازی، بھلائی
اقدامات	:	عمل، تدبیریں	لازوال	:	ہمیشہ رہنے والا، جس کو زوال نہ ہو
بانی	:	بنیاد ڈالنے والا، شروع کرنے والا	مبنی	:	قائم، منحصر

بدظن	:	بدگمان، برا گمان یا شک کرنا	متمول	:	مال دار، امیر، دولت مند
پراگندہ	:	بکھرا ہوا، متفرق	متوسطین	:	درمیانی زمانے کے
پرتو	:	عکس، پرچھاواں، جھلک	محمل	:	ڈولی
ثانوی	:	دوسرا نظریہ	مروّجہ	:	جو رائج یا جاری ہو
ثقافتی	:	تہذیبی	مسحور	:	جس پر جادو کیا گیا ہو، سحر زدہ
جریدہ	:	اخبار، صحیفہ، رسالہ	مطلق	:	آزاد، بے قید
جسدِ خاکی	:	فانی جسم	معرکہ	:	جنگ، لڑائی، جدل
جہت	:	طرف، سمت، سبب، وجہ	معمہ	:	راز، بھید، پہیلی
حِسّیت	:	محسوس کرنے کی استداد	مقیم	:	ٹھہرنا، قیام کرنا
درخشندہ	:	تابناک، روشن، درخشاں	منفرد	:	تنہا، اکیلا، یکتا
رُوشناس	:	جان پہچان، واقف	موجِ حوادث	:	حوادث کی لہر
سیراب	:	پیاس بجھانا، تشنہ لبی دور کرنا	والہانہ	:	عاشقوں جیسا
صعوبتیں	:	پریشانیاں	یاسیت	:	اداسی، ناامیدی

06.09 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : جدید اُردو شاعری کا پس منظر بیان کیجیے؟

سوال نمبر۲ : کسی ایک غزل گو شاعر کے حالات زندگی پیش کیجیے؟

سوال نمبر۳ : اکائی میں شامل کسی ایک نظم گو شاعر کی شعری خصوصیات پر اظہار خیال کیجیے؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : جدید اُردو شاعری پر ایک مضمون قلم بند کیجیے؟

سوال نمبر۲ : فیضؔ احمد فیضؔ یا مجازؔ کی شاعری پر روشنی ڈالیے؟

سوال نمبر۳ : جدید اُردو شاعری کے نمائندہ غزل گو شعرا پر ایک نوٹ لکھیے

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : فانیؔ کی ولادت کب ہوئی؟

(الف) ۱۸۷۹ء (ب) ۱۹۰۰ء (ج) ۱۹۲۰ء (د) ۱۹۲۵ء

سوال نمبر۲ : حسرتؔ کی پیدائش کہاں ہوئی ؟

(الف) بریلی (ب) موہان (ج) دہلی (د) لکھنؤ

سوال نمبر۳ : سید فضل الحسن کس شاعر کا اصل نام تھا؟

(الف) حسرتؔ (ب) میرؔ (ج) غالبؔ (د) فراقؔ

سوال نمبر۴ : اصغر گونڈویؔ کی وفات کب ہوئی ؟

(الف) ۱۹۱۰ء (ب) ۱۹۲۰ء (ج) ۱۹۳۶ء (د) ۱۹۴۵ء

سوال نمبر۵ : مندرجہ ذیل شعر کس شاعر کا ہے؟

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا

مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

(الف) میرؔ (ب) غالبؔ (ج) جگرؔ (د) یگانہؔ

سوال نمبر۶ : جگرؔ کی پیدائش کہاں ہوئی ؟

(الف) لکھنؤ (ب) بنارس (ج) رام پور (د) علی گڑھ

سوال نمبر۷ : نظم ''آوارہ'' کے شاعر کون ہیں؟

(الف) علامہ اقبالؔ (ب) مجازؔ (ج) فراقؔ (د) اخترالایمان

سوال نمبر۸ : ''تاج محل'' کس شاعر کی مشہور نظم ہے؟

(الف) ساحرؔ لدھیانوی (ب) فیضؔ (ج) میراجی (د) ن.م.راشد

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (الف) ۱۸۷۹ء

جواب نمبر۲ : (ب) موہان

جواب نمبر۳ : (الف) حسرتؔ

جواب نمبر۴ : (ج) ۱۹۳۶ء

جواب نمبر۵ : (د) یگانہ

جواب نمبر۶ : (ب) بنارس

جواب نمبر۷ : (ب) مجازؔ

جواب نمبر۸ : (الف) ساحرؔ لدھیانوی

06.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ جدید اُردو شاعری از عبدالقادر سروری

۲۔ جدید شاعری از عبادت بریلوی

۳۔ نظم جدید کی کروٹیں از وزیر آغا

۴۔ نئی شعری روایت از مظفر حنفی

بلاک نمبر 02

اکائی	07	دبستانِ دہلی	ڈاکٹر فاطمہ پروین
اکائی	08	دبستانِ لکھنؤ	پروفیسر آفتاب احمد آفاقی
اکائی	09	فورٹ ولیم کالج	ڈاکٹر صابر علی
اکائی	10	دہلی کالج	غلام جیلانی
اکائی	11	فورٹ سینٹ جارج کالج	محمد سالم
اکائی	12	بیسویں صدی کے چند اشاعتی ادارے	ڈاکٹر محمود کاظمی

اکائی 07 دبستانِ دہلی

ساخت

07.01 : اغراض ومقاصد

07.02 : تمہید

07.03 : دبستان کا مفہوم

07.04 : دبستانِ دہلی

07.05 : دبستانِ دہلی کی شاعری کی خصوصیات

07.06 : خلاصہ

07.07 : فرہنگ

07.08 : نمونہ امتحانی سوالات

07.09 : حوالہ جاتی کتب

07.10 : اپنے مطالعے کے جانچ کے جوابات

07.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ مندرجہ ذیل موضوعات کا مطالعہ حاصل کریں گے:

اُردوادب کے مطالعے میں طلباء کو دبستانوں کے تعلق سے بھی متعارف کرایا جاتا ہے۔اس اکائی میں اردوادب کے بالخصوص اردو شاعری کے دواہم دبستان یعنی دبستانِ دہلی اور لکھنؤ میں سے کسی ایک کے بارے میں آپ کو معلومات سے واقف کرایا جانا ہے۔اس اکائی کے توسط سے آپ دبستانِ دہلی کی خصوصیات اوران سے تعلق رکھنے والے اہم شاعروں کے مقام ومرتبے اوران کے لب ولہجے نیز طرزِفکر اور جذبہ وخیال کی انفرادیت کے بارے میں سیر حاصل معلومات کر پائیں گے۔

07.02 تمہید

اردوشاعری کے آغاز ارتقا اور اہم خصوصیات کا جائزہ لیتے وقت چند اہم نکات ہمارے سامنے آتے ہیں۔مختلف علامتوں اور زمانوں کی شاعری کا فرق،تہذیبی ومعاشرتی خوبیوں کے جداگانہ اثرات،لب ولہجہ میں،اُسلوب وطرزِادامیں ایک الگ رنگ اور مضمون باندھنے کا ایک الگ ڈھنگ یہ ظاہر کرتا ہے کہ معاشرتی عوامل،سیاسی اُتھل پتھل اور جبر کی صورتیں اُسلوب واداا ور طرزِفکر کو نہ صرف یہ کہ متاثر کرتی ہیں بلکہ ایک نئی سمت،ایک نیاانداز اور ایک نیا آہنگ بھی دیتی ہیں۔اردوشاعری مختلف مقامات پر،مختلف زمانوں میں،مختلف حالات کے تحت کتنے ہی روپ لیتی رہی،کتنی ہی شکلیں بدلتی رہی اس کا مطالعہ ضروری ہے۔دہلی اور لکھنؤ میں تقریباً ایک ہی زمانے میں ہورہی شاعری

لب ولہجہ اور طرز وفکر و ادا کے نقطۂ نظر سے ایک دوسرے سے اتنی مختلف کیوں ہے اور شاعری کی ان دو مختلف شکلوں کے نمائندے لکھنؤ اور دہلی دونوں دبستان میں موجود ہیں۔لکھنؤ مزاج کی نمائندگی صرف لکھنؤ میں ناسخ ہی نہیں کرتے دلی میں شاہ نصیر بھی کرتے ہیں۔اسی طرح دہلی کی شاعری اور اس کی خصوصیات میر وغالب کے یہاں بھی ہیں اور آتش کے یہاں بھی۔دراصل کس طرح کی شاعری کہاں زیادہ ہوئی۔اس کو مدّنظر رکھتے ہوئے ادبی وشعری دبستانوں کا تعین کیا جاتا ہے اور یہی معیار اردو کے دو اہم شعری وادبی دبستان یعنی دبستانِ دہلی اور دبستان لکھنؤ کے تعلق سے بھی قبول کیا جائے گا۔

07.03 دبستان کا مفہوم

دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کے بارے میں معلومات پیش کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ لفظ دبستان اور ادب میں اس کے استعمال کے بارے میں معلومات آپ تک پہنچائی جائیں۔لفظ دبستان کے لغوی معنی مدرسہ یا اسکول کے ہیں۔اصطلاح میں مخصوص مقام، عہدے کے اجتماعی مطالعے کے ذریعے مخصوص عصر کے ادبی رجحان کا مطالعہ اور اس دَور کی نسبتاً عام خصوصیات کو واضح کرنے کا عمل دبستان کا مطالعہ کہلاتا ہے۔ابتدائی دَور میں اردو کی ترقی اور اس کے دَور کی اہم خصوصیات کا مطالعہ دبستانِ بیجاپور اور دبستانِ گولکنڈہ کے عنوان سے کیا جاتا ہے۔اسی طرح دہلی میں اردو شعروادب کی ترقی کا مطالعہ دبستانِ دہلی کے تحت اور اس روایت کا تسلسل لکھنؤ کی سرخی سے کیا جاتا ہے۔

07.04 دبستانِ دہلی

دبستانِ دہلی کا مطالعہ ولؔی کے سفر دہلی ۱۷۰۰ء کے بعد اردو شعروادب سے دل چسپی سے شروع ہوتا ہے کیوں کہ اسی کے بعد وہاں اُردو میں شعر گوئی سے دل چسپی کے رجحان میں اضافہ ہوا اور باضابطہ اردو میں شاعری شروع ہوئی۔ابتدا میں فطری رجحان کے مطابق اہل دکن اور خاص طور پر دلّی کی پیروی کی گئی اور بعد میں فطرتِ انسانی کے عین مطابق اس میں نئی راہیں نکالنے کے لیے غور وفکر سے کام لیا گیا۔یہ تبدیلی زبان وبیان ہر دَور میں روا رکھی گئی۔ولؔی کی پیروی میں جن شعرا نے شاعری کی ان میں اہمیت کے حامل فائزؔ، آبروؔ، ناجیؔ، یک رنگؔ اور حاتمؔ وغیرہ ہیں۔اس سے قبل دہلی میں کوئی شاعر سنجیدگی سے اردو کی طرف مائل نہیں تھا۔چند شعرا ایسے تھے جو اردو فارسی کا پیوند لگا کر غزل کو ہزل (وہ کلام جس میں مزاح کے مضامین ہوں) کی شکل دے کر اس مخلوط شکل سے دل بہلانے کا کام لے رہے تھے ان میں خواجہ عطا، جعفر زٹلی اور اٹل وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

فائزؔ، آبروؔ، ناجیؔ وغیرہ کی شاعری اہلِ دہلی کے دکن سے قریبی روابط ولؔی، سراجؔ وغیرہ کی غزل گوئی اسے اثر آفرینی، ساتھ ہی سیاسی، سماجی حالات میں تبدیلی کی وجہ سے عمل میں آئی۔اردو زبان سے جسے قبل ازیں شمال میں صرف بول چال کی حد تک استعمال کیا جاتا تھا فارسی کی طرح ادبی اہمیت کی حامل سمجھی جانے لگی۔

مرزا مظہر جانِ جاناں نے اصلاحِ زبان کے نام سے ایک تحریک شروع کی جس کی رَو سے زبان میں مستعمل بے شمار مقامی الفاظ جیسے سجن پتیم، پریتم، من، پریم کے بجائے ان کے متبادل فارسی الفاظ مثلاً محبوب، معشوق، دل، قلب، عشق وغیرہ کے استعمال کو ترجیح دی جانے لگی۔الفاظ کی اس تبدیلی کے پیچھے ایک جذبہ تو فاتحانہ تفاخر کا سمجھا جاسکتا ہے اور دوسرا معاشرتی اثرات کا فارسی صدیوں کے استعمال سے کچھ ایسی رچی بسی ہوئی تھی کہ اس کے الفاظ کا استعمال اہلِ دہلی کے لیے نسبتاً سہل تھا۔

دوسری وجہ انسان تنوّع چاہتا ہے، تبدیلی کا جویا بنتا ہے ولیؔ اوران کے ہم عصروں کی زبان کافی کچھ استعمال ہو چکی تھی اور خود دکن میں بھی فارسی عربی الفاظ کے استعمال میں اضافہ ہو رہا تھا ایسے ہی شمال میں بھی ان الفاظ کے استعمال میں شدت برتی گئی۔ زبان ہی نہیں بیان میں بھی فارسی کے ادب سے خوشہ چینی کرتے ہوئے معاملاتِ حُسن وعشق کے بیان میں فارسی کی پیروی کے رجحان کو اپنایا گیا۔

تشبیہ، استعارہ، تلمیح وغیرہ میں بھی فارسی کی تقلید کو ترجیح دی جانے لگی ویسے قدیم اردو (دکنی) نے بھی فارسی سے بہت کچھ مستعار لیا تھا لیکن ساتھ ہی مقامی رنگ وآہنگ نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس کے زیادہ استعمال کی شعوری کوشش کی۔ غرض کہ فائزؔ، یک رنگؔ، ناجیؔ، فغاںؔ وغیرہ کا کلام طرز ولیؔ کی پیروی کا نمائندہ ہے تو مرزا مظہر جانِ جاناں کی شاعری اور شاہ حاتمؔ ''دیوان زادہ'' وغیرہ اصلاح کے رجحان کی عکاسی کرتے ہیں۔ مظہرؔ کی اس کوشش نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی اور اس کا مطالعہ اصلاحِ زبان کی کوشش کے عنوان سے کیا جاتا ہے۔

سیاسی، سماجی حالات، قبول ورَد اور مختلف عوامل نے اردو شاعری کے اس حصے میں ایک خاص شکل اختیار کر لی اور یہ دَور انتہائی اہمیت کا حامل بن گیا۔ شاعری کی مختلف اصناف جیسے غزل، قصیدہ، مثنوی وغیرہ کے بے مثال شعرا اس دَور میں ادبی اُفق پر نمودار ہوئے اور یہ دَور دبستانِ دہلی کے دَورِ اوّل کے نام سے تاریخ ادب کا نہایت اہم دَور قرار پایا۔ غزل میں خارجیت اور داخلیت کے متوازن امتزاج نے اثر آفریں غزلوں کا ضخیم سرمایہ فراہم کیا اور بے شمار شعرا جیسے سوداؔ، میرؔ، دردؔ وغیرہ اہم غزل گو شعرا کے طور پر سامنے آئے۔ ایہام گوئی کو متروک قرار دیا گیا۔ نئے نئے محاورے اور مضامین فارسی زبان سے اردو میں منتقل ہوئے۔ غزل اور قصیدہ کے ساتھ مثنوی، مرثیہ وغیرہ دیگر اصناف سے بھی انصاف کیا گیا۔ تذکروں کا رواج عام ہوا جس میں شعرا کی زندگی کے حالات، ادبی پس منظر لکھا جانے لگا۔ مشاعروں کی ابتدائی معاصرانہ شعری چشمکوں نے ادب کو دل کش ترین بنا دیا۔

نادر شاہ، محمد شاہ ابدالی کے پے در پے حملے مرہٹوں اور روہیلوں کی بغاوت نے دہلی والوں پر ایسی مصیبت ڈھائی کہ سماجی اور تہذیبی زندگی منتشر ہوگئی۔ اس منتشر زندگی کا اثر دہلی کے شعرا پر بھی پڑا۔ حالات کے جبر نے شعرا کو سادگی پسند بنا دیا۔ تصنع وبناوٹ ترک ہوگئی۔ وارداتِ قلب کا پراثر بیان، سادگی، خوب صورت تشبیہات واستعارات کا برمحل استعمال اور اثر آفرینی نے ان شعرا کی غزلوں کو خصوصی رنگ و آہنگ بخشا، ان کی غزلیں عوام وخواص میں مشہور ومقبول ہوگئیں۔

دہلی کے خارجی حالات دہلی کے شعرا کے داخلی حالات بن گئے۔ شاعری میں سوز وگداز شامل ہوگیا یہی وجہ ہے کہ اس دَور کے شاعروں کے اشعار میں غم کی لہریں کسی نہ کسی شکل میں نظر آتی ہیں۔ خاص طور پر میرؔ کی شاعری کو دل اور دِلّی کا مرثیہ کہا جاتا ہے۔ سوداؔ، میرؔ، حسنؔ، دردؔ تمام اہم شعرا کے پاس غم کی ایک لہر ضرور ملتی ہے انشاؔ اور رنگینؔ کو چھوڑ کر مصحفیؔ اور جرأتؔ کے پاس بے تکلفی کا عنصر شامل ہے۔

07.05 دبستانِ دہلی کی شاعری کی خصوصیات

ذیل میں چند اشعار بطور مثال درج کیے جا رہے ہیں جن سے مندرجہ بالا جملوں کی تصدیق ہوتی نظر آتی ہے۔

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ — نادان پھر وہ دل سے بھلایا نہ جائے گا

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

جو ملا اس نے بے وفائی کی — کچھ عجیب رنگ ہے زمانے کا

آنکھوں سے جو پوچھا حال دل کا اک بوند ٹپک پڑی لہو کی
ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے درد و غم اتنے کیے جمع کہ دیوان کیا
میرؔ

☆☆☆

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
دردؔ

خونِ دل چشم سے بہتا تھا مرے دامن تک موجزن تا بہ گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا
سوداؔ

دہلی کی تباہی نے بہت سارے شعرا کو نقلِ مقانی پر مجبور کر دیا۔سراج الدین علی خاں آرزو، سوداؔ، میرؔ، میر حسنؔ، انشاؔ، مصحفیؔ وغیرہ دہلی چھوڑ کر لکھنؤ جانے پر مجبور ہوئے لیکن دہلی کی مرکزیت باقی و برقرار رہی۔دردؔ نے دہلی کو چھوڑنا منظور نہ کیا اور کچھ وقفے کے بعد دبستانِ دہلی نے پھر سے اپنی بساط کو سنوارا۔سیاسی اُلٹ پلٹ، افراتفری، انتشار نے دردمندی کے ساتھ تصوّف کو بھی جگہ دی۔تصوّف کی یہ روایت اردو شاعری میں ایران کی تہذیبی و ادبی تقلید کی وجہ سے داخل ہوئی۔دہلی کی سیاسی، ابتری و بدحالی نے اس روایت کو پختگی اور گہرائی عطا کی۔غم ذات اور غمِ زمانہ کے ستائے ہوئے لوگوں نے تصوّف کے دامن میں پناہ لی۔سوداؔ، میرؔ، غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ تقریباً تمام اہم شعرا کے پاس تصوّف کے مضامین ملتے ہیں۔خواجہ میر دردؔ کی تو پوری شاعری ہی تصوّف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔وحدت الوجود، فنافی اللہ، دنیا کی بے ثباتی جیسے مضامین پر تقریباً تمام شاعروں نے اظہارِ خیال کی۔

ذیل میں چند اشعار بطور مثال درج کیے جا رہے ہیں۔

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا موسیٰ نہیں کہ سیر کروں کوہِ طور کا
سوداؔ

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
غالب

غالبؔ، مومنؔ، شیفتہؔ، شاہ نصیرؔ، ظفرؔ، ذوقؔ کا زمانہ آتے آتے سیاسی حالات میں مزید ابتری پیدا ہو گئی تھی مگر ان شعرا نے اپنی شاعری میں نزاکت، باریک بینی، نئی نئی تشبیہیں، مضمون آفرینی، خیال بندی پر زیادہ زور دیا۔شاہ نصیرؔ، ذوقؔ اور ظفرؔ جو زبان دانی اور زبان سازی پر زور دیتے ہیں ایک حد تک لکھنؤ سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں کیوں کہ آتشؔ، ناسخؔ اور ان کے شاگردوں کا کلام دہلی پہنچنا شروع ہو گیا تھا۔

غالبؔ اور مومنؔ وغیرہ جو معنی پر زیادہ زور دیتے تھے مضمون آفرینی پر زیادہ زور دیتے نظر آتے ہیں۔ذوقؔ کے پاس زبان کا چٹخارہ، محاورہ بندی اور روزمرّہ کی دل کشی نمایاں نظر آتی ہے۔ظفر زبان کی سلاست، جذبے کی حدت اور اثر آفرینی پر ایقان و ایمان رکھتے ہیں۔مذکورہ جملوں کی صداقت ثابت کرنے کے لئے چند شعرا کے کلام سے کچھ زبان زد اشعار مثالاً پیشِ خدمت ہیں۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم نجات پائے کیوں
غالبؔ

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
مومنؔ

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے
ذوقؔ

اب تو گھبرا کر یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
ذوقؔ

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا بہتر ہے ملاقات مسیحا و نظر سے
ذوقؔ

☆☆☆

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکا میں وہ ایک مشت غبار ہوں

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے ہنگاموں نے دہلی میں زندگی کو بری طرح متاثر کیا۔ زندگی کا ہر شعبہ اس سے متاثر ہوا۔ شعرا تلاش معاش میں دوسری ریاستوں کا رُخ کرنے پر مجبور ہوئے۔ داغؔ پہلے رام پور پھر حیدرآباد چلے گئے۔ ظفرؔ کو قید کر کے رنگوں بھیج دیا گیا۔ شیفتہؔ کا گھر لٹ گیا۔ غالبؔ کے خطوط سے غدر کے بعد دہلی کی صورتِ حال کا اندازہ ہوتا ہے۔

غرض یہ کہ ۱۷۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک کا دَور اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ اس دَوران شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں بلند پایہ شاعروں کی منفرد تخلیقات کا اضافہ ہوا۔ غزل میں سوداؔ، میرؔ، مومنؔ اور ذوقؔ جیسے شعرا نے اضافے کیے اور اس دَور کی غزل کا عام رجحان سادگی، حقیقت پسندی، وارداتِ قلب کی عکاسی، خوب تشبیہات و استعارات کا استعمال، زبان کی صفائی وغیرہ رہا۔

میر تقی میرؔ کی شاعرانہ مہارت کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں ''خدائے سخن'' کہا گیا۔ قصیدہ کو مرزا محمد رفیع سوداؔ نے کچھ اس طور پر برتا کہ اُردو قصیدہ فارسی کے قریب پہنچ گیا اور سودا نے اسے صرف مدّاحی کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ اپنے عہد کے حالات اس میں محفوظ کر دیے۔ ''قصیدہ تضحیکِ روزگار'' اس کی بہترین مثال کہی جاسکتی ہے۔ تقریباً تمام ہی اہم شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی کی لیکن سب سے زیادہ مقبولیت اور شہرت سوداؔ کے قصیدوں کو حاصل ہوئی۔

سوداؔ، میر ضمیرؔ، میرؔ وغیرہ نے مرثیہ نگاری میں بھی کئی تجربے کیے اور پانچ اور چھ مصرعوں میں مرثیے لکھے جن میں مسدّس والی ہیئت مرثیہ کے لیے زیادہ موزوں سمجھی گئی۔ مرثیے کے ارکان یعنی چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت، بین وغیرہ کی طرف توجہ دینے کی ابتدا بھی دہلی میں ہی ہوئی جس کی انتہا ہمیں میر انیسؔ کے پاس نظر آتی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ ولؔی نے کس سنہ میں دہلی کا سفر کیا؟

﴿۲﴾ ولؔی کے پیروی میں کن شعرا نے شاعری کی؟

﴿۳﴾ دہلی کے چند اہم غزل گو شعرا کے نام تحریر کیجیے۔

﴿۴﴾ قصیدہ نگاری کے طور پر کس شاعر نے غیر معمولی شہرت حاصل کی؟

﴿۵﴾ مثنوی ''سحر البیان'' اور مثنوی ''گلزارِ نسیم'' کا تعلق کس دبستان سے ہے؟

07.06 خلاصہ

اس اکائی میں دبستانِ دہلی کا تعارف کراتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ دبستانِ دہلی کے اہم شعرا میرؔ، سوداؔ، دردؔ، غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ اور ظفؔر وغیرہ تھے۔ انہوں نے غزل، قصیدہ اور دوسری اصناف میں قابلِ قدر اضافے کیے اور ان کی غزلوں میں سوز و گداز، مضمون آفرینی، اثر آفرینی پائی جاتی ہے۔ اصلیت، سادگی اور جوش سے کام لینے کی کوشش ملتی ہے۔ وارداتِ قلبی کا بیان پُر اثر انداز میں ملتا ہے۔ دہلی کی تباہی کی وجہ سے بیشتر شعرا لکھنؤ جانے پر مجبور ہوئے۔ لکھنؤ میں انہیں عزت و احترام ملا اُن کے فن کی قدر کی گئی۔ شعرائے لکھنؤ نے ان کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ ان کی شاگردی اختیار کی۔ آگے چل کر اہلِ لکھنؤ نے ایک نیا طرزِ اظہار نکالا جس میں تکلف و تصنع، جمالیاتی حُسن، الفاظ کی بازی گری، علمیت کے اظہار کو زیادہ اہم سمجھا گیا اور اس کی وجہ سے شاعری کا تاثر متاثر ہوا لیکن ساتھ ہی فن کارانہ انداز میں مزید صفائی ہوگئی۔ اچھے شعر اور اچھی شاعری سے یہ دَور خالی نہیں لیکن غالب کا ذخیرہ ایسا ہے جس کا مطالعہ کرنے پر درج بالا رائے قائم کرنی پڑتی ہے۔

لکھنؤ میں مرثیہ نے جو ترقی کی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ صالح سماج اور معاشرہ اعلیٰ اقدار کی اہمیت و افادیت، مثال کردار، بے مثال منظر کشی، رشتوں کا تقدّس، مرثیوں کے ذریعہ پیش کیا گیا۔ خارجی موضوعات جیسے تلوار کی تعریف، گھوڑے کی تعریف وغیرہ بھی بڑی مہارت سے مرثیوں کا حصہ بنے۔

اردو کی دو اہم مثنویاں جو متضاد و منفرد خصوصیات کی حامل ہیں ان کا تعلق اسی دبستان سے ہے۔ مثنوی ''سحر البیان'' اور مثنوی ''گلزارِ نسیم'' یہ دونوں شاہکار اسی دبستان کی علمی خدمات کے ثبوت ہیں۔ سحر البیان، جذبات نگاری، محاورے کا لطف، واقعہ نگاری، حفظِ مراتب کو پیش کرتی ہے۔ اس کے اشعار ضرب المثل کے طور پر آج بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ جو اس مقبولیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ''گلزارِ نسیم'' برجستگی، اختصار، استعاروں کی ندرت اور تشبیہات کی دل کشی سے مالا مال ہے۔ تناسبِ لفظی، بندش کی چستی اور کلام کی پختگی نے اسے اور غیر معمولی مقبولیت عطا کی۔ اس طرح ہر دَور دبستان اپنی مخصوص خصوصیات کے ساتھ اہمیت کے حامل اور تاریخِ ادب کا اٹوٹ حصہ ہیں۔

07.07 فرہنگ

آہنگ	: انداز، ڈھنگ، طور طریقہ	رو	: سبب، وجہ، باعث، ضابطہ
ابتری	: خرابی، تباہی و بربادی	روپ لینا	: بھیس بدلنا
اٹوٹ	: نہ ٹوٹنے والا	سرمایہ	: سامان، زرِ اصل، راس المال، پونجی

امتزاج	: اختلاط، دو یا زیادہ چیزوں کی ترکیب یا آمیزش
انحطاط	: زوال، گراوٹ
باضابطہ	: باقاعدہ، باترتیب، حسبِ معمول
بدحالی	: خستہ وشکستہ، مفلسی، فلاکت
بلند پایہ	: عظیم المرتبت، عالی مقام، اونچے رتبے کا
پیروی	: تقلید، کسی کے عمل کو نمونہ بنا کر ویسا ہی کرنے کا عمل، اتباع وتعمیل
پیوند	: وابستگی، میل، تعلق، الفاظ کی بندش
تفاخر	: فخر، ناز، بڑائی ظاہر کرنا، باہم فخر کرنا
خوشہ چینی	: توڑنا، اصطلاحاً اثر قبول کرنا، فائدہ اٹھانا
ڈھنگ	: طرز، انداز، روش، عادت
رخ کرنا	: کسی جگہ جانا
شدت	: زور، زیادتی، سختی
ضخیم	: بڑے حجم والا، بڑی جسامت والا، موٹا
متروک	: ترک کردہ، چھوڑا ہوا، جسے چھوڑ دیا جائے
متضاد	: برعکس، الٹا، مخالف
مخلوط	: ملاجلا
مستعمل	: استعمال
ندرت	: نیاپن
نقطۂ نظر	: دیکھنے یا سوچنے کا انداز یا نظریہ
نقل مکانی	: تبدیلی مکان، ایک مکان چھوڑ کر دوسرے مکان میں جانا
نکات	: نکتہ کی جمع، باریکیاں، لطیف باتیں
نمودار	: ظاہر، آشکار، عیاں، نمایاں
ہیئت	: شکل، بناوٹ

07.08 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : دبستانِ دہلی سے کیا مراد ہے؟

سوال نمبر۲ : دبستانِ دہلی کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

سوال نمبر۳ : دبستانِ دہلی کی چند اہم خصوصیات تحریر کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : دبستانِ دہلی کے کسی ایک شاعر پر نوٹ لکھیے۔

سوال نمبر۲ : دبستانِ دہلی سے متعلق ایک جامع مضمون تحریر کیجیے؟

07.09 حوالہ جاتی کتب

۱۔ تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ

۲۔ دبستان لکھنؤ از ابواللیث صدیقی

۳۔ دہلی کا دبستان شاعری از ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

۴۔ دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی وفکری پس منظر از ڈاکٹر محمد حسن

07.10 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ ولؔی نے ۱۷۰۰ء میں دہلی کا سفر کیا۔

﴿۲﴾ ولؔی کی پیروی میں فائزؔ، یک رنگ، ناجی، فغاںؔ نے شاعری کی۔

﴿۳﴾ دہلی کے اہم غزل گوشعرا سوؔدا، میرؔ، دردؔ، غالبؔ، ذوقؔ، ظفؔر اور مومنؔ وغیرہ ہیں۔

﴿۴﴾ قصیدہ نگاری کے طور پر مرزا محمد رفیع سوؔدا نے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔

﴿۵﴾ مثنوی ''سحر البیان'' اور مثنوی ''گلزارِ نسیم'' کا تعلق دبستانِ لکھنؤ سے ہے۔

اکائی 08 دبستانِ لکھنؤ

ساخت

08.01 : اغراض ومقاصد

08.02 : تمہید

08.03 : دبستانِ لکھنؤ

08.04 : دبستانِ لکھنؤ کی خوبیاں

08.05 : دبستانِ لکھنؤ کی خامیاں

08.06 : خلاصہ

08.07 : فرہنگ

08.08 : نمونہ امتحانی سوالات

08.09 : حوالہ جاتی کتب

08.10 : اپنے مطالعے کے جانچ کے جوابات

08.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ دبستانِ لکھنؤ سے متعلق تفصیلی جانکاری حاصل کریں گے۔ دبستانِ لکھنؤ کے وجود میں آنے کے اسباب، اہم شعرا لکھنو کی شاعری کی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔ اس اکائی سے آپ جہاں دبستانِ لکھنؤ سے واقف ہوں گے وہیں انھیں دو دبستانوں کی شاعری میں فرق وامتیاز کے اسباب کا بھی بخوبی علم ہوگا۔ آپ یہ بھی جان سکیں گے کہ اردو ادب کے دو دبستان: دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ میں ادبی اعتبار سے کیا فرق ہے؟ آیئے ہم دیکھتے ہیں کہ دبستانِ لکھنؤ کی کیا خوبیاں ہیں۔

08.02 تمہید

اُردو شاعری کی ترقی اور فروغ میں ہندوستان کے مختلف علاقوں نے حصہ لیا ہے۔ شمالی ہند اور دکن کے شاعروں نے اپنے احساسات وجذبات کے اظہار کا وسیلہ اردو شاعری کو بنایا۔ انفرادی کوششوں کے علاوہ ملک میں مختلف مراکز قائم ہوئے۔ ان میں دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد اور رام پور اہم مقامات ہیں۔ ان میں سے ہر جگہ اور ہر مرکز کی کچھ اہم خصوصیات ہیں جس کی بنا پر انھیں اسکول یا دبستان کا درجہ حاصل ہے۔ یہ تمام دبستان، شاعری اور فکر کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ ہیں اور یہی پہچان انھیں انفرادیت عطا کرتی ہے۔

08.03 دبستانِ لکھنؤ

لکھنو کی آبادکاری دہلی کی تباہی کی داستان سے جڑی ہوئی ہے۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ مختلف صوبے خودمختار ہو گئے ان میں صوبۂ اودھ بھی تھا، ۱۷۲۲ء میں سعادت خاں صوبۂ اَودھ کے صوبیدار مقرر کئے گئے، انھوں نے لکھنؤ کی بجائے فیض آباد کو اپنا مسکن بنایا۔ سعادت علی خاں کے بہتر انتظام سے اَودھ میں خوشحالی آئی۔ شجاع الدولہ نے لکھنؤ بسایا لیکن سیاسی وجوہات کے پیشِ نظر فیض آباد میں قیام اختیار کرنا پڑا۔ ان کے بعد آصف الدولہ نے فیض آباد کی جگہ لکھنؤ کو دارالسلطنت بنایا۔

انگریزوں کی مداخلت تو شجاع الدولہ کے زمانے میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ آصف الدولہ کے زمانے میں اودھ کا سارا نظام انگریزوں کے اشارے پر چلنے لگا۔ دوسری طرف دہلی میں زبردست انتشار اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ مغلیہ سلطنت روبہ زوال تھی۔ اس پر نادر شاہ کے حملے اور مرہٹوں کے ہنگاموں نے شرفا اور باکمال لوگوں کے لیے دہلی میں رہائش ناقابل برداشت ہو چکی تھی، انھوں نے ترکِ وطن کر کے پناہ کی تلاش میں اَودھ، روہیل کھنڈ، فرخ آباد، مرشدآباد اور دکن وغیرہ کی ریاستوں میں پناہ لی۔ اودھ قریب ہونے کی وجہ سے زیادہ تر لوگ یہاں پہنچے۔ اس کی اہم وجہ تھی کہ انگریزوں کی مداخلت سے اَودھ کی آزادی تو چھن گئی لیکن ان سے صلح کے نتیجے میں اَودھ کو پرامن اور خوشحال زندگی نصیب ہوئی۔ عیش وعشرت کی زندگی خوشی کا لازمی نتیجہ تھی۔ ہر طرف راگ ورنگ کی بزم آراستہ ہو گئی اور شعر سخن کی محفل سج گئی۔

ادھر دہلی میں اہل کمال کی گزر مشکل ہو گئی تو وہ ایک ایک کر کے لکھنؤ میں جمع ہو گئے ان میں بڑی تعداد شاعروں کی تھی۔ میر ضاحکؔ، سوزؔ، دردؔ وغیرہ تو پہلے ہی اَودھ پہنچ کر مشاعروں میں مقبولیت حاصل کر چکے تھے پھر میر حسنؔ، جراتؔ، انشاؔ، مصحفیؔ اور رنگینؔ وغیرہ پہنچے اور دبستانِ لکھنؤ کی بنیاد پڑی۔ جراتؔ کا مزاج ہمیشہ معاملہ بندی کی طرف مائل تھا۔ لکھنؤ کے رنگین ماحول میں شاعری کا یہ انداز بہت مقبول ہوا اور دیگر شعرا بھی اس رنگ میں رنگتے چلے گئے۔ لکھنؤ کے غیر سنجیدہ ماحول سے اخلاقی قدروں کا ایسا زوال ہو گیا تھا کہ انشاؔ و مصحفیؔ کی شاعرانہ چشمک نے ہزل دشنام اور پھر سوانگ کی شکل اختیار کر لی۔

اگر اردو ادب کا مطالعہ کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ اردو شاعری کے ارتقاء میں دہلی اور کلکتہ کو کافی اہمیت ہے ہم ان دونوں شہروں کی ادبی دنیا کو دو الگ الگ دبستانوں سے جانتے ہیں۔ دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ لیکن ان دونوں دبستانوں کا تاریخی پس منظر کیا تھا؟ اس سے بھی ہمیں واقفیت ہونی چاہیے۔ یہاں ہم دبستانِ لکھنؤ کے تاریخی پس منظر پر نگاہ ڈالیں گے۔

دہلی کی شان وشوکت اور مرکزیت کے خاتمے کے بعد لکھنؤ کو عروج حاصل ہوا اور بہت سی خوش گوار اور ناگوار تبدیلیاں لکھنؤ میں دیکھنے کو ملتی ہیں خصوصاً اردو ادب کے حوالے سے بات کی جائے تو اردو ادب میں ایک خاص قسم کی تبدیلی پیدا ہوئی جس میں فکری پھوہڑ پن اور سوقیانہ رنگ شاعری نظر آتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد دہلی کی بربادی دوسرے شہروں کی آبادی کا باعث بنی۔ چنانچہ حیدرآباد، فرخ آباد، مرشدآباد، بھوپال، رام پور، ٹونک اور اَودھ (لکھنؤ) جیسے شہروں میں کافی رونق بڑھی اور بڑے بڑے فنکار اور ادیب دہلی سے منتقل ہو کر ان شہروں کی طرف کوچ کر گئے۔ ان تمام شہروں میں اَودھ کی سلطنت کو غیر معمولی ادبی اور تہذیبی حیثیت حاصل ہوئی۔ ابتدا میں اودھ کے

نوابین، وزرا کا پایہ سلطنت فیض آباد تھا لیکن فیض آباد کو صرف ایک چھاؤنی کی حیثیت حاصل تھی۔ فیض آباد کو شجاع الدولہ اور ان کی بیوی بہو بیگم نے ایک ادبی اور ثقافتی مرکز بنا دیا۔ شجاع الدولہ نے اَوَدھ کو ایک بار پھر ہندوستان کے نقشے پر ایک نمایاں مقام دلا دیا۔ جو شعرا اور اُدبا دہلی کی پریشان حالی سے نکل کر لکھنؤ کی طرف منتقل ہوئے تھے انھیں پناہ دی گئی۔ حالاں کہ اَوَدھ کی دنیائے شاعری میں سرپرست کی حیثیت سے آصف الدولہ کا کردار نہایت اہم رہا ہے۔ آصف الدولہ نے فیض آباد سے الگ ہو کر لکھنؤ کو اپنا مرکز بنایا اور اس کی ترقی میں کافی اہم رول ادا کیا۔ اَوَدھ کی دنیائے شاعری اور لکھنؤ میں شعرا کی آمد کے متعلق احتشام حسین لکھتے ہیں:

''اس بات کا اندازہ لگانا دشوار ہے کہ دلی کے شعرا کی آمد سے پہلے اَوَدھ میں اردو زبان کی کیا حالت تھی یہ درست ہے کہ لکھنؤ کے گرد و نواح میں تصوّف کے بڑے بڑے مرکز اور مسلمان اہل علم کی بڑی بڑی بستیاں آباد تھیں لکھنؤ میں شاہ مینا کا مزار مرجع خلائق تھا۔ رُدولی، خیر آباد، کاکوری، سندیلہ، موہان، صفی پور چھوٹے چھوٹے علمی مراکز تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ لکھنؤ اور فیض آباد میں اردو شاعری کی روایت موجود تھی یا نہیں مگر یہ بات غور طلب ہے کہ جب اَوَدھ کے ابتدائی زمانے میں دہلی کے خاموش شعرا اور میر ضاحک سوز، سودا فغاں وغیرہ یہاں آئے تو وہ غیر متعارف نہ تھے۔ شاعروں میں ان کا احترام ہوتا تھا اور اسی قدردانی کی وجہ سے وہ یہاں رہے اور ایک نئے مرکز کے قیام میں معین ہوئے جو بتدریج اپنا انفرادی رنگ بناتا گیا۔''

(اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ صفحہ ۸۵)

لکھنؤ کا ماحول ریختی ہوئی کو بھی بہت راس آیا۔ ریختی شاعری کی وہ صنف ہے جس میں عورتوں کے جذبات انھیں کی زبان میں پیش کیے جاتے ہیں۔ رنگین اور انشا نے اس صنف میں خوب دل چسپی لی۔ اس کے بعد کی نسل میں تاریخ کا نام قابلِ ذکر ہے۔ جنھوں نے اصلاحِ زبان پر خاص توجہ دی۔ ناسخ کے شاگردوں میں وزیر، برق، رشک، بحر، منیر اور آتش کے شاگردوں میں رند، صبا، نسیم اور شوق وغیرہ نے دبستانِ لکھنؤ کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان شاعروں نے معاملہ بندی اور خارجی متعلقاتِ حُسن کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور شاعری جذبے کی بالائی سطح کا وسیلۂ اظہار ہو کر رہ گئی۔ شعرائے لکھنؤ نے اپنی تمام تر توجہ شعر کی ظاہری صورت پر صرف کی اور جذبات نگاری کو پسِ پشت ڈال کر تصنّع، تکلف اور لفظی مرصع کاری کو اہمیت دی۔ الفاظ کی تراش خراش اور اس کی ظاہری چمک دمک میں زندگی کے مسائل و موضوعات کی سنجیدگی اوجھل ہو گئی۔ شاعر عورتوں کے زلف و رخسار، کاکل اور گیسو، ان کے حُسن اور جذبات کو اشارے کی بجائے ظاہر طور پر بیان کرنے لگے۔ سوز و گداز کی جگہ عیش و نشاط نے لے لی۔ اس طرح لکھنؤ ''آہ'' کی جگہ ''واہ'' کا دبستان بن گیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ اورنگ زیب کی وفات کس سن میں ہوئی؟

﴿۲﴾ لکھنؤ کو کس نواب نے بسایا؟

﴿۳﴾ اصلاح زبان پر کس شاعر نے توجہ دی؟

08.04 دبستانِ لکھنؤ کی خوبیاں

دبستانِ لکھنؤ کی نمایاں خصوصیات میں سب سے اہم یہ ہے کہ یہاں کی شاعری میں نشاطیہ عنصر غالب نظر آتا ہے۔یعنی اگر دبستانِ دہلی پریشانی اور رنج والم کی ترجمان ہے تو دبستانِ لکھنؤ کے شعری سرمایے میں مسرت کی لہر دوڑتی نظر آتی ہے،لکھنؤ کی پر امن اور خوشحال زندگی کا نتیجہ ہے۔لکھنؤ کی شاعری میں عورت کے حُسن کا بھر پور بیان ملتا ہے۔زلف،کاکل،گیسو،جوڑا،چوٹی،کنگھی اور مشاطہ کے علاوہ ان کے زیور،لباس کی پوری تفصیلات موجود ہیں۔اس سے شاعری میں سطحیت تو ضرور پیدا ہوگئی ہے لیکن اردو شاعری جو اس سے قبل نسوانی حُسن کے ذکر سے محروم تھی اس میں صنفِ نازک کے تذکرے غزل کے لیے مخصوص ہو گئے۔

لکھنوی شعرا نے اگر چہ ہندی کے بہت سے الفاظ اور محاورے ترک کر دیے جو دہلی میں عام طور پر مروّج تھے لیکن لکھنؤ میں ہندو سماج،ہندوانہ رسم ورواج اور روایات کو خاصا فروغ ملا۔واقعہ یہ ہے کہ دبستانِ لکھنؤ کی شاعری زبان کے نقطۂ نظر سے زیادہ دلکش اور پر کشش ہے۔یہ اَوَدھی کا علاقہ ہے اس لیے یہاں کی زبان اور زبان سے زیادہ لہجہ نرم اور شریں ہے۔اس کا ایک سبب اور بھی ہے،اہلِ لکھنؤ ہر معاملے میں دہلی والوں سے الگ اور ممتاز نظر آنے کے خواہاں رہے۔لکھنؤ کی شاعری پر داخلیت کو مجروح کرنے اور رمز واشارہ کو بے نقاب کرنے کا الزام اپنی جگہ درست ہے لیکن اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ لکھنوی شعرا کی کوششوں سے اردو زبان کو وسعت حاصل ہوئی اور فن شاعری کے اُصول مرتب ہوئے۔الفاظ کی تراش خراش اور اندازِ بیان میں جدت وشستگی کے لیے نئے پہلو سامنے آئے اور شاعری مرصع کاری، حسنِ ظاہری اور رنگینیوں سے جگمگا اُٹھی۔

دبستانِ لکھنؤ سے وابستہ بہت سے شعرا نے اپنی شاعری کے ذریعے ایسی شہرت حاصل کی جو انھیں دہلی کے قیام کے زمانے میں نہ حاصل ہو سکی تھی۔اس دبستان سے وابستہ جو اہم شعرا کے نام اردو ادب کی تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں اُن میں اہم نام جرأت،انشاؔء،رنگینؔ، مصحفیؔ،میرؔ اور سوداؔ وغیرہ ہیں۔ان شعرا میں رنگینؔ نے ایک خاص طرز ایجاد کی تھی جسے ریختی کہتے ہیں۔رنگینؔ کے دیوان میں ہر صنف کی نظمیں ملتی ہیں۔ان کی غزلوں میں تخیل کا کوئی کمال نظر نہیں آتا۔اُنھیں جو بھی اہمیت حاصل ہے۔وہ ان کے ان موضوعات کے بیان سے ہے جس میں انھوں نے عورتوں کی بول چال میں انھیں کی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل پر بہت نظمیں لکھیں اور یہ دعویٰ کیا کہ وہی اس طرز کے موجد ہیں اور اس طرز کو اردو ادب کی تاریخ میں ریختی کا نام دیا گیا۔معروف دانشور اور نقاد احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''ریختی کو اردو کے ادیبوں نے کوئی اہمیت نہیں دی ہے کیوں کہ اس میں بلند اخلاقی خیالات اور سنجیدگی کا فقدان ہوتا ہے۔بات یہ ہے کہ ایک منتے ہوئے سامنتی سماج میں عورت کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔اس کا سکھ اور دکھ نہیں سمجھا جاتا۔اس لیے اگر رنگین اور انشاء نے اَوَدھ کی عشرت آلودہ سماج میں عورت کی طرف بھی دیکھا تو اسے تاریخی اہمیت ضرور ہی دینا چاہیے۔اس میں شبہ نہیں کہ یہ شعرا اپنے سامنے کوئی بلند نصب العین نہیں رکھتے تھے۔نہ ان کا کوئی بڑا مقصد تھا اور نہ وہ نسوانی معاشرہ کی فلاح کے لیے ہی لکھتے تھے لیکن یہ صنف شاعری کئی حیثیتوں سے مطالعہ کے لائق ہے۔''

(اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ صفحہ ۹۲)

ریختی سے قطعِ نظر اس دَور کے شعرا نے بہت اچھی شاعری کی مثالیں پیش کی ہیں اور اپنی شعری تخلیقات سے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔ یہاں چند شعرا کے اشعار نقل کیے جاتے ہیں جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ دبستانِ لکھنؤ سے تعلق رکھنے والے شعرا کے یہاں تخیل اور موضوعات کا تنوّع بھی پایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی کہیں کہیں ابتذال بھی جگہ پا جاتا ہے۔

﴿شیخ قلندر بخش جرأتؔ﴾ :

جرأتؔ دلّی کی شان وشوکت کے زوال کے بعد فیض آباد آئے تھے اور وہیں انھیں شہرت حاصل ہوئی۔ جرأت جس وقت لکھنؤ آئے تو یہاں مرزا اسلیمان شکوہ کا دربار گرم تھا وہ شاہ عالم کے بیٹے تھے اور آصف الدولہ کے عہد حکومت میں لکھنؤ چلے آئے تھے۔ جرأت بھی انہیں کے درباری ہو گئے۔ کیوں کہ وہ شعرا کی کافی توقیر دعزت کیا کرتے تھے۔ جرأتؔ بہت زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے لیکن زبان کے استعمال میں کامل تھے۔ وہ محبت کے جذبات اس انداز سے پیش کرتے تھے کہ اس میں کبھی کبھی فحاشی اور پھوہڑ پن کا رنگ غالب آ جاتا تھا۔ جرأتؔ نے جذباتِ انسانی کی پیش کش میں صرف عاشقانہ معاملہ بندی کو اپنایا تھا اور اس کو وہ مختلف طریقے سے پیش کرتے تھے۔

مجھے تم دوانہ بنا کر چلے — پری سا جو مکھڑا دکھا کر چلے

☆☆☆

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں
ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں

﴿انشاءاللہ خاں انشاؔء﴾ :

انشاؔ کا شمار شاعر کی حیثیت سے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ بڑے عالم اور تیز ذہن رکھنے والے شخص تھے۔ وہ کئی زبانیں جانتے تھے۔ انشاؔء زندگی کو ایک کھیل کا میدان سمجھ کر ہردَم اس میں کود پڑنے کو تیار رہتے تھے۔ وہ اپنی ہنسی، دل لگی کی باتوں سے زندگی کو قابلِ برداشت بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ ابھی انشاؔ کو لکھنؤ میں زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اپنے کلام، چٹکلوں اور برجستہ گفتگو کے انداز سے صرف دربار میں ہی مقبول نہیں ہوئے تھے بلکہ پوری دنیائے شاعری میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کر چکے تھے۔ انشاء کا ایک فارسی دیوان بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف رانی کیتکی کی کہانی ہے جسے اردو ادب میں کافی مقبولیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تصانیف میں دریائے لطافت، لطائف السعادت اور سلکِ گہر بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کی جدّت اور ندرت پائی جاتی ہے اور ان کے اشعار ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں:

نہ چھیڑا ے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

☆☆☆

تصوّر عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں رادھا کے کنڈ پر
اوتار بن کر گرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پر

دبستانِ دہلی سے متعلق ایک مشہور شاعر رنگین بھی ہیں جن کا نام سعادت یار خاں اور رنگین تخلص تھا۔ وہ ایک تجارت پیشہ شاعر تھے۔ امیروں اور نوابوں کے دربار میں ان کی خاص عزت وتکریم ہوتی تھی ان کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں عیش پسند زندگی گزارنے کا موقع نصیب ہوا تھا۔ ان کی تصنیفات میں چار دیوان، مختلف مثنویاں اور ایک کتاب ''مجالسِ رنگین'' کے نام سے ملتی ہے۔ انھوں نے عورتوں کی بول چال میں انھیں کی زندگی سے تعلق رکھنے والے موضوعات ومسائل پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ ان کے اشعار میں فحاشی اور پھکڑ پن نمایاں طور پر ملتا ہے۔ اس لیے ہم ان اشعار کونقل کرنا یہاں مناسب نہیں سمجھتے۔

اس عہد کے شعرا میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ مصحفی امروہہ کے رہنے والے تھے اور تلاشِ معاش میں اِدھر اُدھر جاتے رہے۔ بالآخر لکھنؤ چلے آئے۔ مصحفی اردو کے بہترین شاعر شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں جذباتیت، سلاست اور سادگی پائی جاتی ہے۔ وہ ممتاز فارسی اور اردو شعرا کے طرز کو اپنانے کی کوشش کرتے رہے جس کی وجہ سے ان کا اپنا کوئی مخصوص رنگ غالب نہ آسکا۔ ان کے یہ اشعار دیکھیں۔

چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم   کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

☆☆☆

مصحفی ہم تو یہ مجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

☆☆☆

جو سیر کرنی ہے کرلے کہ جب خزاں آئی
نہ گل رہے گا چمن میں نہ خار ٹھہرے گا

یہاں جن شعرا کا ذکر کیا گیا ہے ان کا زیادہ تر وقت دوسرے مقامات پر گزرا لیکن اپنی زندگی کے آخری حصے میں وہ لکھنؤ آ گئے تھے اور یہاں کے ہوکر رہ گئے۔ ان شعرا کے علاوہ اور بھی بہت سے شعرا کے نام ملتے ہیں جو دبستانِ دہلی سے وابستہ رہے۔ انہوں نے اپنی ایک الگ انفرادیت قائم کی اور شاعری کی نئی فضا ہموار کی جس سے دبستانِ لکھنؤ کی شاعری میں کچھ اہم خصوصیات پیدا ہوگئیں۔

لکھنؤ کی شاعری کی ایک نہایت اہم خصوصیت یہ ہے کہ شاعر نے غزل میں خواہ کیسے ہی رندانہ بلکہ عریاں مضامین کیوں نہ باندھے ہوں۔ مقطع میں وہ غالباً حصولِ سعادت کی نیت سے اکثر علی اور کبھی کبھی حضرت حسین یا حضرت حسن یا رسول مقبول کا پنجتن اور امام زمن کا ذکر کرتا ہے کبھی ان کی محبت کا دَم بھرتا ہے اور کبھی نعت ومنقبت کو حسنِ طلب کا ذریعہ بناتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۴﴾ لکھنؤ کی شاعری میں کسی چیز کا بیان ملتا ہے؟

﴿۵﴾ دبستانِ لکھنؤ کی شاعری کسی نقطۂ نظر سے زیادہ دلکش ہے؟

﴿۶﴾ لکھنؤ کی شاعری پر کسی طرح کا الزام عائد ہوتا ہے؟

﴿۷﴾ رنگین نے ایک خاص طرز شاعری میں ایجاد کی تھی، اس کا کیا نام تھا؟

﴿۸﴾ رانی کیتکی کی کہانی کس کی تصنیف ہے؟

﴿۹﴾ مصحفی کہاں کے رہنے والے تھے؟

﴿۱۰﴾ پری سا جو مکھڑا دکھا کر چلے ☆ مجھے تم دیوانہ بنا کر چلے...... یہ کس کا شعر ہے؟

﴿۱۱﴾ نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی ☆ تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
مذکورہ بالا شعر کس کا ہے؟

08.05 دبستانِ لکھنؤ کی خامیاں

دبستانِ لکھنؤ ایک ایسے عہد میں وجود میں آیا جب لکھنؤ ایسی فضاؤں میں سانس لے رہا تھا جن میں زندگی بظاہر رنگ عیش ونشاط اور حُسن و جمال کی رنگینیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شام اَوَدھ روشنی کے ساتھ شروع ہوتی اور پائلوں کی کھنک اور طبلے کی تھاپ پر رات اختتام پذیر ہوتی۔ طوائفیں ایک مکمل ادارے کی طرح لکھنوی تہذیب کا حصہ بن گئیں تھیں۔ دبستانِ دہلی میں تصوف اور غور وفکر کو بنیادی حیثیت حاصل تھی لیکن لکھنؤ میں اس کی قدریں کھوٹا سکہ قرار پائیں۔ حُسنِ حقیقی کی جگہ حُسنِ مجازی مرکزِ نگاہ بن گیا۔

لکھنوی تہذیب کی یہ ساری کمزوریاں اس عہد کی شاعری میں داخل ہو گئیں۔ یہ درست ہے کہ میرؔ، سوداؔ اور مصحفیؔ پر دہلی کی داخلیت کے اثرات پختہ تھے لیکن انشاؔ، جرأت، رنگینؔ اور دوسرے سینکڑوں شعرا نے عشق وحسن کے اور عورتوں کے جسم کی بناوٹ کو رمز وشاریت کی جگہ کھلے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ عاشق ومعشوق کے تعلقات کا برملا اظہار اور وصل کی لذتوں کو الفاظ کے پیکر میں برتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نسوانی اعضائے بدن مثلاً: سینے، چھاتیوں، ناف، پیٹ، کمر، کولھوں اور پنڈلیوں کے متعلق عریاں اور حیا سوز اشعار صرف بازاری شعرا ہی نے نہیں لکھے بلکہ ان بزرگوں نے بھی اس غلاظت کو اچھالا ہے جو سوسائٹی میں معزز اور مقتدر سمجھے جاتے تھے۔ رعایتِ لفظی، ضلع جگت، تشبیہ واستعارہ کے پر تکلف استعمال سے شاعری گداز، گھلاوٹ اور اثر آفرینی سے محروم ہو گئی۔ علاوہ ازیں ہندوستانی زبان کے شیریں الفاظ کی جگہ فارسی و عربی کے مشکل الفاظ کا چلن عام ہوا۔ اس دبستان سے وابستہ شاعروں نے خارجیت کو داخلیت پر اور ظاہر الفاظ کو معنی پر ترجیح دی اور صرف الفاظ کے استعمال کو اصل شاعری سمجھ بیٹھے۔

دبستانِ دہلی سے وابستہ شعرا کی خامیوں سے متعلق بہت کی باتیں لکھی جاسکتی ہیں مگر ہم یہاں اردو کے ایک اہم ناقد احتشام حسین کی رائے نقل کرتے ہیں:

> ''اگر لکھنو کے مکتب شاعری کی خصوصیات و معائب دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ جو شعرا دہلی سے آئے تھے وہ اپنا اسلوب اور انداز لے کر آئے تھے لیکن تھوڑے دنوں بعد لکھنؤ کے سماجی اور اقتصادی حالات میں کچھ ایسی

تبدیلیاں ہوئیں جن میں یہاں کی زبان اور ادب دونوں کا دِلّی سے الگ اُسلوب بن گیا ابتدا میں تو یہ تبدیلیاں نادانستہ طور پر اور لاشعوری طریقے سے ہوئی ہوں گی مگر بعد میں پہلے کے شاعروں اور ادیبوں نے شعوری طور پر اپنے رنگ کو دِلّی سے الگ کرنے کی کوشش کی اور اس میں ان کو کامیابی بھی ہوئی۔ اَوَدھ کی پوری تہذیب اور زندگی میں ایک خاص طرح کی لچک اور نزاکت پیدا ہوگئی جس نے خارجی حُسن اور اس کے بیان کو تصنع کے رنگ میں رنگ دیا اور لکھنے والوں نے الفاظ کا ایک ایسا ڈھونگ کھڑا کر دیا کہ زندگی کے مسائل و موضوعات کی سنجیدگی اس میں ڈوب کر رہ گئی۔''

مذکورہ اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دبستانِ دہلی کے تحت شاعری کرنے والے شعرا کے یہاں لفاظی اور تصنع کی کارفرمائی نظر آتی ہے جو خارجیت سے پُر نظر آتی ہے اور جس میں زندگی کے حقائق کی عکاسی بالکل ہی مفقود نظر آتی ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دبستان دہلی جس میں مقصدیت اور زندگی کی سچائیاں دیکھنے کو ملتی ہیں اس سے قدرے مختلف دبستانِ لکھنؤ کی شاعری ملتی ہے جس میں صرف خارجیت اور زندگی کے حقائق سے دُوری نظر آتی ہے۔ اسی لیے دبستانِ لکھنؤ کی شاعری کو وہ مقام و مرتبہ حاصل نہ ہوسکا جو دبستانِ دہلی کو حاصل ہوا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱۲﴾ دبستانِ لکھنؤ اہم خاصیت کیا ہے؟

﴿۱۳﴾ دبستانِ لکھنؤ نے داخلیت پر توجہ دی یا خارجیت پر۔

﴿۱۴﴾ دبستانِ لکھنؤ کی ایک خامی بتایئے۔

08.06 خلاصہ

اُردو شعر و ادب کو فروغ دینے میں جن مراکز نے اہم رول ادا کیا ان میں دبستانِ لکھنؤ تو بے حد اہم ہے۔ دبستانِ لکھنؤ کا قیام اس زمانے میں عمل میں آیا۔ جب دہلی میں انتشار اور بے چینی تھی۔ پے در پے اندرونی اور بیرونی حملوں نے یہاں کے لوگوں کی زندگی تنگ کر دی تھی۔ دوسری طرف لکھنؤ میں خوش حالی اور آسودگی تھی۔ نوابین اَوَدھ حُسن و جمال کے رسیا تھے اور رقص و سرود کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔ پہلو بہ پہلو وہ شعر و ادب میں دل چسپی لیتے اور شعرا کی قدر کرتے تھے۔ دہلی کی غیر یقینی ماحول سے بے زار لوگوں نے امن و سکون کی تلاش میں مختلف صوبوں کا رخ کیا ان میں وہ لوگ بھی تھے جن سے دلّی میں شعر و ادب کی بزم روشن تھی۔ ابتدا میں آنے والوں میں سراج الدین خاں، سوداؔ، میرؔ اور میر سوزؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔ وہ ترکِ وطن کر کے لکھنؤ آئے اور یہاں کے ہو کر رہ گئے لیکن ان کے مزاج میں دبستانِ دہلی کی شاعری رچ بس چکی تھی لہٰذا وہ لکھنوی اندازِ فکر سے متاثر نہیں ہوئے اور دہلی کے رنگ کو قائم رکھا۔ ان کے بعد جرأتؔ، انشاءؔ، مصحفیؔ اور رنگینؔ وغیرہ لکھنؤ آئے ان کی شاعری کی ابتدا دہلی میں ہوئی مگر ان سب کا عروج لکھنؤ میں ہوا۔ پھر ناسخؔ اور آتشؔ بھی آئے اور ایک نیا دبستان قائم ہوا۔ ان لوگوں نے زبان کی اصلاح کی زبان کی ونوک پلک درست کی نئی تراکیب ایجاد کیں۔ زبان و بیان میں لطافت و نزاکت پیدا کی اور شاعری کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ ان کے بعد شاعروں کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے جنھوں نے اس نئے رنگ کو مزید چمکایا اور لکھنویت کے ہر انداز کو اپنی شاعری میں برتا ہے۔

08.07 خلاصہ

آسودگی	:	سکھ، اطمینان، آرام	رقص وسرود	:	گانے اور ناچنے کا عمل
انفرادیت	:	خصوصیت، تخصیص	ضلع جگت	:	پہلو دار بات، جس میں لفظی رعایت پائی جائے۔
پھوہڑپن	:	بدسلیقگی، ناشائستگی			
ترکِ وطن	:	اپنا گھر چھوڑنا	مداخلت	:	دخل دینا
تصنع	:	بناوٹ ظاہری	مرصع کاری	:	نگینہ یا جواہرات جڑا ہوا
خارجی	:	ظاہری	معاملہ بندی	:	بیتی ہوئی باتوں کو نظم کرنا، سوانگ
داخلی	:	اندرونی	مفقود	:	ناپید، ندارد
دبستان	:	اسکول مدرسہ	مقتدر	:	اقتدار رکھنے والا، طاقت ور
دشنام	:	گالی گلوج	ہزل	:	بے ہودہ بات مذاق

08.08 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : دبستانِ لکھنؤ کا پس منظر بیان کیجیے۔

سوال نمبر۲ : جرأتؔ اور انشاؔ کی شاعری پر اظہار خیال کیجیے۔

سوال نمبر۳ : دبستانِ لکھنؤ سے وابستہ ابتدائی دَور کے شعرا کا تعارف پیش کیجیے؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : دبستانِ لکھنؤ کی خامیاں کیا ہیں؟

سوال نمبر۲ : دبستانِ لکھنؤ کی شاعری پر نوٹ لکھیے۔

سوال نمبر۳ : دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

08.09 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ از پروفیسر احتشام حسین

۲۔ اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ از سنبل نگار

۳۔ دو دبستان از پروفیسر ابواللیث صدیقی

08.10 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء میں ہوئی

﴿۲﴾ سراج الدولہ نے

﴿۳﴾ ناسخ نے اصلاح زبان پر خصوصی توجہ دی۔

﴿۴﴾ عورت کے حُسن کا بھرپور بیان ملتا ہے۔

﴿۵﴾ زبان کے نقطۂ نظر سے زیادہ دلکش ہے۔

﴿۶﴾ لکھنؤ کی شاعری پر داخلیت کو مجروح کرنے اور رمز و اشارہ کو بے نقاب کرنے کا الزام عائد ہوتا ہے۔

﴿۷﴾ ریختی

﴿۸﴾ انشاء کی

﴿۹﴾ امروہہ کے

﴿۱۰﴾ جرأت کا

﴿۱۱﴾ انشاء اللہ خان انشاء کی

﴿۱۲﴾ یہاں کی نشاطیہ شاعری

﴿۱۳﴾ دبستانِ لکھنؤ میں خارجیت پر توجہ دی گئی۔

﴿۱۴﴾ اشعار میں عریانیت

اکائی 09 فورٹ ولیم کالج

ساخت

09.01 : اغراض ومقاصد

09.02 : تمہید

09.03 : فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد

09.04 : فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنّفین

09.05 : فورٹ ولیم کالج کی نثری خدمات

09.06 : خلاصہ

09.07 : فرہنگ

09.08 : نمونہ امتحانی سوالات

09.09 : حوالہ جاتی کتب

09.10 : اپنے مطالعے کے جانچ کے جوابات

09.01 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ فورٹ ولیم کالج کے قیام اس کے مقاصد اور اس کی خدمات سے واقف ہوں گے۔ اس کالج سے وابستہ مصنّفین کا تعارف اور ان کے کاموں کے علاوہ اردو نثر کی ترقی میں فورٹ ولیم کالج کے رول کی جانکاری فراہم کی جائے گی۔

09.02 تمہید

اردو کی ترقی اور فروغ میں ذاتی کوششوں کے علاوہ مختلف انجمنوں، اداروں اور غیر ملکی قلم کاروں کی کوششیں بے حد اہم ہیں۔ انہی اداروں میں فورٹ ولیم کالج ہے جو انگریزوں کے ذریعہ قائم ہوا لیکن اس کالج نے اردو زبان وادب کی ترقی میں نا قابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔ تصنیف وترجمہ پر مامور ادیبوں اور قلم کاروں نے اردو نثر کو فارسی کے مشکل الفاظ اور جملوں سے نجات دلا دی۔ ان کی کوششوں سے اردو نثر عام فہم، سادہ اور سہل ہوئی جو آنے والے لوگوں کے لیے نشان راہ ثابت ہوئی۔

09.03 فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد

۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں ہندوستان کی شکست کے بعد شمالی ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار قائم ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مغلیہ سلطنت کمزور ہو گئی۔ انگریز اس حقیقت سے واقف تھے کہ ملک پر حکومت کرنے کے لیے ہندوستانی زبانوں سے واقفیت ضروری ہے۔ اس وقت حکومت کی زبان فارسی تھی لیکن سارے ملک میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان اردو تھی جسے ہندی اور ہندوستانی کہا جاتا تھا۔ چنانچہ

انگریزوں نے اس زبان کو سیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی نیز ہم وطن لوگوں کو اسے سکھانا چاہا۔ اس سے قبل کئی دوسرے انگریز مصنّفین ہندوستانی زبان سے متعلق چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھ چکے تھے۔

جن مغربی مصنّفین نے ہندوستانی ادب اور خصوصاً اردو ادب میں اپنی گراں قدر خدمات انجام دیں ان میں جان گلکرسٹ کا نام سرِفہرست ہے۔ جان گلکرسٹ فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی زبان کے شعبے کے صدر تھے۔ انھوں نے ۱۷۸۵ء سے اردو قواعد اور لغات کے متعلق لکھنا شروع کیا اور کم و بیش یہ سلسلہ ۱۸۰۵ء تک جاری رہا۔ ہندوستانی جاننے والوں کی حیثیت سے ان کی شہرت اتنی زیادہ پھیل گئی تھی کہ جس وقت اردو زبان کی ترویج و ترقی کی خاطر کلکتے میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا تو جان گلکرسٹ کو ہندوستانی زبان کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ گلکرسٹ کی نگرانی میں اردو زبان کی نہایت اہم کتابیں تصنیف کی گئیں اور مختلف کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کیا گیا۔

جان گلکرسٹ ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت کرتے تھے۔ ۱۷۸۳ء میں انھیں ہندوستان بھیجا گیا جب وہ ہندوستان آئے تو انھیں ہندستانی زبان اور تہذیب بہت پسند آئی اور خصوصاً اردو زبان سیکھنے کا انھیں بہت شوق ہوا۔ گلکرسٹ نے اردو زبان باقاعدہ طور پر کھی۔ بعد ازاں گلکرسٹ نے بول چال، قواعد، لغت وغیرہ پر انگریزی اور اردو زبان میں متعدد کتابیں تصنیف کیں گلکرسٹ نے جو کتابیں لکھیں ان میں انگریزی ہندوستانی ڈکشنری (۱۷۹۰ء) ہندوستانی گرامر (۱۷۹۶ء) اور ینٹیل لنگونسٹ (۱۷۹۸ء) قصص مشرق (۱۸۰۳ء) رہنمائے زبان اُردو (۱۸۰۴ء) قواعد اردو اور انگریزی بول چال (۱۸۲۰ء) وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔

انیسویں صدی کے آغاز سے قبل ہندوستان کے بڑے حصے پر انگریزی اقتدار کا سایہ منڈلانے لگا تھا مغل شہنشاہ شاہ عالم نے بنگال اور بہار کی مال گزاری وصول کرنے کا اختیار ایسٹ انڈیا کمپنی کو سونپ دیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کے لیے یہ لازمی ہو گیا تھا کہ وہ یہاں کی زبانیں سیکھیں تاکہ انھیں عوام کو سمجھنے اور حکومت کرنے میں آسانی ہو۔ اس کمپنی میں جو بھی انگریز ملازم بن کر آئے انھیں ہندوستانی زبان نہیں آتی تھی اور ہندوستان میں ایسا کوئی ادارہ نہیں تھا جو انھیں ہندوستانی زبان سکھاتا۔

لارڈ ولزلی نے کمپنی کے ڈائرکٹروں سے اجازت لی اور ۴ رمئی ۱۸۰۰ء کو کلکتے میں فورٹ ولیم کالج کا افتتاح کیا۔ اس کالج کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ نئے انگریز ملازمین کو ہندوستانی زبانوں کی تعلیم دی جائے۔ حالاں کہ اس کالج میں مختلف زبانیں سکھائی جاتی تھیں۔ اس وقت تک انگریز زیادہ تر فارسی زبان پڑھتے تھے مگر رفتہ رفتہ انھیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ پورے ملک میں ہندوستانی رائج ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ اُس زمانے میں بولی جانے والی اردو زبان کو ہندوستانی کہا جاتا تھا۔ لہٰذا انھوں نے فارسی کے بجائے اپنی توجہ اردو زبان کی طرف مبذول کی۔ کالج میں تعلیم کا منصوبہ تو بہت منظّم تھا مگر کمپنی نے اس کے چلانے کا بوجھ اٹھانا قبول نہیں کیا اس لیے اس کا کام صرف زبانوں کی تعلیم تک محدود ہو کر رہ گیا۔

ڈاکٹر گلگرسٹ اردو زبان میں جو کچھ بھی تھا اس سے تھوڑی بہت شناسائی اور شد بد رکھتے تھے انھوں نے اپنی دانست میں یہ محسوس کیا کہ نظم کے مقابلے نثری ذخیرہ کافی کم ہے اور جو بھی نثر ہے وہ مذہبی نوعیت کی ہے۔ غیر ملکیوں کو ایسے تعلیمی مواد سے تعلیم نہیں دی جا سکتی ہے۔ اس لیے انھوں نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے تعلیم کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا ایک شعبہ بھی قائم کیا اور پورے ہندوستان سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اردو کے جید عالموں اور مصنفوں کو فورٹ ولیم کالج میں جمع کر دیا۔

کتابوں کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب درس و تدریس کے لیے موزوں کتابوں کی تلاش کی گئی۔ اندازہ ہوا کہ جس انداز کی درسی کتابیں عام فہم اور عام بول چال کی زبان سکھانے کے لیے درکار ہیں وہ ناپید ہیں۔ چنانچہ اخبار میں اشتہار شائع کر کے اہل قلم کو فورٹ ولیم کالج کی جانب متوجہ کیا گیا۔ ملک کے مختلف حصوں سے ملازمت کے لیے درخواستیں موصول ہوئیں بعدازاں ان درخواستوں پر غور وخوض کیا گیا اور مترجمین و مصنّفین کی تقرری عمل میں لائی گئیں۔ مصنّفین کی تقرری کے بعد شعبۂ تصنیف و تالیف قائم ہوا۔ ان میں لکھنے والوں کے دو درجے قائم کیے گئے منشی اور ماتحت منشی ان کے اوپر چیف منشی اور سکنڈ منشی تھے۔ چیف منشی کے عہدے پر میر بہادر علی حسینی کا تقرر عمل میں ہوا جن کی اس وقت دوسو روپے ماہانہ تنخواہ تھی۔ تارنی چرن سکنڈ منشی مقرر کیے گئے۔ ان کی تنخواہ سو روپے ماہوار تھی۔ میر امن، میر حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، مرزا لطف علی، مظہر علی خاں ولا، بینی نرائن جہاں، مرزا کاظم علی جوان، نہال چند لاہوری، مرزا جان طپش، اکرام علی، خلیل خاں اشک، غلام غوث، کندن لال، کاشی راج، للّو لال جی وغیرہ کا تقرر منشیوں میں ہوا۔ ہندوستانی شعبے کی سربراہی جان گلکرسٹ کو سونپی گئی وہ اس عہدے کے لئے نہایت موزوں اور اہل امیدوار تھا۔ گلکرسٹ نے ایک بڑا کتب خانہ اور کتابوں کی اشاعت کے لیے پریس بھی قائم کیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ فورٹ ولیم کالج کب اور کہاں قائم ہوا؟

﴿۲﴾ اردو کو کن دوسرے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔

﴿۳﴾ فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی زبان کے پہلے صدر کون تھے؟

09.04 فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنّفین

فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنّفین جنھوں نے اپنی تخلیقی قوت سے اردو زبان میں تاریخی کارنامے انجام دیے۔

﴿۱﴾ میر امان میر امّن دہلوی :

میر امن کا نام میر امان تھا اور امّن تخلص کرتے تھے، دہلی کے رہنے والے تھے۔ دہلی کی سکونت ترک کر کے پٹنہ آئے اس کے بعد کلکتہ پہنچے۔ میر بہادر علی حسینی کے ذریعے میر امن کی فورٹ ولیم کالج تک رسائی ہوئی اور منشی کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ جان گلکرسٹ نے ان سے فارسی داستان چہار درویش کا ترجمہ کرایا تا کہ انگریز افسروں کو بہ آسانی اردو سکھائی جائے۔ میر امن نے باغ و بہار کے نام سے اسے آسان اور بول چال کی زبان میں ڈھال دیا۔ یہ پہلا انقلابی قدم تھا۔ اس سادہ اور پرتکلف نثر نے اردو کو ایک نیا راستہ دکھایا اور اہلِ قلم کو یہ احساس دلایا کہ سادگی کا حُسن بناوٹی حُسن سے زیادہ بہتر ہے۔ اس کے علاوہ اخلاق محسنی کا ''گنج خوبی'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔

فورٹ ولیم کالج میں جو ادیب جمع ہو گئے تھے انھوں نے اپنا فریضہ بہت خوش اسلوبی سے پورا کیا، میر امن نے اپنی مایہ ناز تصنیف ''باغ و بہار'' کے ذریعہ پوری ادبی دنیا میں شہرت حاصل کر لی۔ باغ و بہار کے ابتدا میں میر امن نے حسب دستور کہانی لکھنے کا سبب بھی لکھا ہے۔ ان کے مطابق باغ و بہار امیر خسرو کی چہار درویش پر مبنی ہے جیسا کہ اکثر محققین کی رائے ہے۔ کئی محققین کی رائے ہے کہ میر امن نے اس کا ترجمہ فارسی سے نہیں کیا بلکہ تحسین کی ''نوطرز مرصع'' کو سامنے رکھ کر اسے بول چال کی آسان زبان میں لکھ دیا ہے۔ چنانچہ میر امن نے خود لکھا ہے:

''جان گلکرسٹ صاحب نے لطف سے فرمایا کہ اس قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں، جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اس محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔''

ترجمہ کرتے وقت میر امن نے فارسی کتاب بھی دیکھی۔ مگر یہ بات قرینِ قیاس اور بہت حد تک درست معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے نوطرز مرصع کی ہی پیروی کی ہے اور اس پر اپنی تخلیق ''باغ و بہار'' کی بنیاد رکھی ہے۔ بہرحال اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے مصنّفین میں میر امن دہلوی نے ایسے ادبی شاہکار زیرِ تحریر لائے جو اردو ادب کے سرمایے میں کافی وقیع ہیں۔

﴿۲﴾ حیدر بخش حیدری :

حیدر بخش حیدری قلم کے دھنی تھے اور ان کی تحریر میں کافی زرخیزی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنّفین میں حیدر بخش حیدری نے سب سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں لیکن ان کی لکھی ہوئی تمام کتابیں شائع نہیں ہو سکی ہیں۔ حیدری دہلی کے رہنے والے تھے مگر ان کا زیادہ تر وقت بنارس میں گزرا۔ جب فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ڈالی گئی تو حیدری بھی کلکتہ پہنچے اور اس کالج میں ملازم ہو گئے۔ وہاں انھوں نے کئی کتابوں کے ترجمے کیے اور طبع زاد کتابیں بھی لکھیں۔ ۱۸۱۴ء میں وہ بنارس گئے اور وہیں ۱۸۲۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔

حیدری کی تصانیف میں ''قصہ مہر و ماہ، لیلیٰ مجنوں ہفت پیکر، تاریخ نادری، گلشن ہند، طوطا کہانی، آرائشِ محفل، گلِ مغفرت'' کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ ان تمام کتابوں میں زیادہ مشہور تین کتابیں ''طوطا کہانی، آرائشِ محفل اور گلِ مغفرت'' ہیں۔ ''طوطا کہانی'' ۱۸۰۱ء میں لکھی گئی۔ یہ کتاب بہت پسند کی گئی اور متعدد بار شائع کی گئی۔ حیدری کی تصانیف میں ''آرائشِ محفل'' سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اس کتاب میں عرب کے مشہور تھی حاتم طائی کے سات خیالی سفروں کی کہانی دل چسپ طریقے سے لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب بھی فارسی کی ایک کتاب پر مبنی ہے مگر حیدری نے اپنی ذہنی خلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہت سی خوش گوار تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ حیدری نے یہ کتاب گلکرسٹ کے ہی کہنے پر ۱۸۰۲ء میں لکھی۔ اس کتاب کی زبان نہایت شیریں اور دل چسپ ہے۔ حیدری شاعر بھی تھے۔ ان کے کلام میں غزل، قصیدے، مرثیے سب ہیں مگر ان کی شہرت ان کی نثری تصانیف کے سبب ہے۔ ان کی زبان آسان ہوتے ہوئے بھی میر امن کی زبان سے مختلف ہے۔ کیوں کہ میر امن فارسی عربی الفاظ کے مقابلے میں ہندی الفاظ کا زیادہ استعمال کرتے تھے اور حیدری کا رجحان فارسی زبان کی طرف زیادہ تھا اس لیے ان کی عبارتیں فارسی الفاظ سے مزین دکھائی دیتی ہیں۔

﴿۳﴾ میر شیر علی افسوس :

میر شیر علی افسوس فورٹ ولیم کالج کے ایک اہم مصنف میر شیر علی افسوس تھے جن کی شہرت فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ وہ دلّی، پٹنہ، لکھنؤ کی ادبی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ انہوں نے میرؔ، سوداؔ، میر حسنؔ، جرأتؔ اور انشاؔ کا زمانہ دیکھا تھا۔ ۱۸۰۲ء میں کلکتہ پہنچ کر گلکرسٹ کی صلاح سے فارسی کی دو کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ۱۸۰۲ء میں شیخ سعدی شیرازی کی مشہور زمانہ کتاب ''گلستان سعدی'' کا ترجمہ اردو میں ''باغِ اردو'' کے نام سے کیا۔ افسوس کی دوسری تصنیف ''آرائشِ محفل'' ہے جو منشی سجان رائے کی فارسی تاریخ ''خلاصۃ التواریخ'' کا اردو ترجمہ ہے۔ افسوس نے فورٹ ولیم کالج کے تحت بہت سی علمی تخلیقات پیش کیں اور شہرت و ناموری حاصل کی۔

﴿۴﴾ مرزا علی لطف :

مرزا علی لطف کالج کے مصنّفین میں مرزا علی لطف بھی اہم شخصیت شمار کیے جاتے تھے۔ وہ دلی کے رہنے والے تھے۔ دلّی کے زوال کے بعد وہ لکھنؤ اور پھر پٹنہ گئے اور پھر پٹنہ سے کلکتہ کا رخ کیا۔ وہاں ان کی ملاقات گلکرسٹ سے ہوئی۔ گلکرسٹ نے اردو شاعروں کا ایک تذکرہ لکھنے کے بارے میں لطف علی کو کہا۔ مرزا لطف نے علی ابراہیم خان کی فارسی تصنیف ''گلزارِ ابراہیم'' کی طرز پر اردو میں ''گلشنِ ہند'' لکھا۔ حالاں کہ اس کتاب کی زبان دقیق اور پیچیدہ ہے۔ تاہم اس کتاب سے معاصر شعرا کے متعلق بہت سی نئی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ یہ کتاب کلکتہ سے شائع نہ ہو سکی۔ کیوں کہ اس کا اصل مسودہ کھو گیا اور اتفاقاً اس کا ایک نسخہ حیدرآباد میں دستیاب ہوا۔ چنانچہ یہ کتاب حیدرآباد سے بھی شائع ہوئی۔ لطف علی بھی کلکتے سے حیدرآباد منتقل ہو چکے تھے اور کلکتہ میں ہی ۱۸۲۲ء میں مرزا علی لطف کا انتقال ہو گیا۔

﴿۵﴾ میر بہادر علی حسینی :

میر بہادر علی حسینی بھی میر امن کی طرح دہلی کے رہنے والے تھے۔ فورٹ ولیم کالج میں ان کا تقرر غالباً سب سے پہلے ہوا۔ انھوں نے مثنوی ''سحر البیان'' کو اردو نثر میں منتقل کیا اور اس کا نام ''نثرِ بے نظیر'' رکھا۔ میر بہادر علی حسینی کی دوسری تصنیف ''اخلاقِ ہندی'' ہے جو کافی مقبول ہوئی۔ اس کتاب کے قصے سنسکرت کی زبان میں لکھی گئی اخلاقی کتابوں کی خوبیوں سے بھری ہوئی کہانیوں پر مشتمل ہیں اور یہ قصے اردو میں فارسی سے منتقل کیے گیے ہیں۔ ۱۸۰۳ء میں یہ کتاب کلکتہ سے شائع ہوئی، میر بہادر علی حسینی کی تیسری کتاب ''تاریخِ آسام'' ہے۔ یہ کتاب بھی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں بھی ہوا تھا۔ حسینی کی ایک خوبی یہ تصوّر کی جاتی ہے کہ انہوں نے گلکرسٹ کی قواعدِ اردو کو بھی مختصر کر کے آسان زبان میں لکھا اور کتاب ۱۸۱۶ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔

کالج کے دیگر مصنّفین میں مظہر علی خاں ولا، مرزا کاظم علی خاں جوان، نہال چند لاہوری، بینی نرائن جہان، للّو لال جی وغیرہ شمار کیے جاتے ہیں۔ جن کی عظیم خدمات سے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا۔

فورٹ ولیم کالج کے مصنّفین اور قلم کاروں کی جو تفصیل اوپر گزری ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زیادہ تر تصانیف داستانوں اور کہانیوں پر مبنی تھیں۔ دراصل یہ کتابیں اس مقصد سے لکھوائی گئی تھیں تا کہ انگلینڈ سے نئے آنے والے انگریز افسران ہندوستان میں بولی جانے والی زبان سیکھ سکیں اور لوگوں سے تبادلۂ خیالات کر سکیں اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کے رہن سہن اور بود و باش سے کسی حد تک واقفیت حاصل کر سکیں۔ یہ دونوں مقاصد ایسی ہی کتابوں سے حاصل کیے جا سکتے تھے۔ جان گلکرسٹ اپنے اس مقصد میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اس کے باوجود تاریخ اردو ادب کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات کی ایک خاص اہمیت ہے۔ جس نے اردو ادب کو نئی جہت عطا کی اور اردو کے سرمایے میں ایک گراں قدر اضافے کا باعث ثابت ہوا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۴﴾ میر امن نے اخلاقِ محسنی کا ترجمہ کسی نام سے کیا؟

﴿۵﴾ حیدر بخش حیدری کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

﴿۶﴾ گلزارِ ابراہیم کے طرز پر مرزا علی لطف نے کون سی کتاب لکھی؟

09.05 فورٹ ولیم کالج کی نثری خدمات

وہ پہلا ادارہ جس نے اردو نثر کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا وہ فورٹ ولیم کالج ہے۔فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر کو علمی وژن اور وقار عطا کیا،اس کی بدولت اردو نثر آزاد فضا میں سانس لینے گئی اور اس میں وسعت پیدا ہوئی۔اس سے قبل فارسی کے مشکل اور پیچیدہ الفاظ کی بھر مار تھی۔فورٹ ولیم کالج نے اس صورت حال کو تبدیل کیا اور اردو میں نثری اظہار کی اپنی مخصوص شان اور انفرادیت نمایاں ہوئی۔اس نے ایک رواں اور بے تکلف نثر کو فروغ دیا۔میر امن کی باغ و بہار،حیدر بخش حیدری کی طوطا کہانی اور آرائشِ محفل میں جو نثر استعمال کی گئی ہے وہ بامحاورہ،پراثر اور جان دار ہے۔بقول ڈاکٹر اعجاز حسین:

> ''فورٹ ولیم کالج کا یہ احسان ہے کہ اس نے نثر نگاری کا ایک مزاج اردو میں تحریک کی شکل میں پیدا کیا اور اس طرح لوگوں کے ذہن کو سنجیدہ مسائل کی طرف موڑا ادب کا مفہوم اب صرف شعر و شاعری تک محدود نہ تھا بلکہ شعر کو بھی ادب میں شمار کیا جانے لگا۔''

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۷﴾ میر امن کا اصل نام کیا تھا؟

﴿۸﴾ تو تا کہانی اور آرائش محفل کس کی کتابیں ہیں؟

﴿۹﴾ فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر کو کیا عطا کیا؟

09.06 خلاصہ

فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں قائم ہوا۔اس کا مقصد انگریزوں کو ہندوستانی سکھانا تھا لہٰذا فارسی اور دوسری زبانوں کی کتابوں کے ترجمے اردو میں کرائے گئے۔یہ ترجمے آسان اور رواں تھے،اس سے قبل اردو نثر کی کتابوں میں عربی و فارسی الفاظ کی بھر مار ہوتی تھی اور اسلوب پر تکلف۔اس کے برعکس فورٹ ولیم کالج کے زیر اثر جو کتابیں ترجمہ کی گئیں ان میں رنگین اور مقفّٰی عبارت کی بجائے آسان اور سادہ طرز اختیار کیا گیا۔خصوصاً میر امن نے اردو کو بولتی چالتی،جیتی جاگتی نثر سے روشناس کیا،اس میں روزمرّہ کی زندگی کا عکس بھی موجود ہے۔فورٹ ولیم کالج سے دراصل اردو نثر کی تاریخ میں ایک انقلاب آیا۔اردو نثر نے علمی اظہار کے ایک موزوں وسیلے کی حیثیت بنائی،اردو اَب محض قصے کہانیوں تک محدود نہ رہی بلکہ اس کا دائرہ پھیل کر اب خاصا وسیع ہو گیا۔

09.07 فرہنگ

انفرادیت	الگ وجود،ذاتی خصوصیت	شکست	ہار
برعکس	الٹا	فروغ	بڑھاوا
تخلص	شاعر کا چھوٹا نام جو وہ اپنے مقطع میں استعمال کرتا ہے	مقفی	قافیے دار
سکونت	مستقل قیام	وقار	قدر جاہ وجلالور

09.08 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : اردو نثر کی ترقی میں کسی ادارے نے اہم رول ادا کیا؟

سوال نمبر۲ : فورٹ ولیم کالج میں جان گل کرسٹ کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۳ : حیدر بخش حیدری اور میر ٹی علی افسوس کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : میر امن کی نثر کی خصوصیات بیان کیجیے

سوال نمبر۲ : فورٹ ولیم کالج کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۳ : فورٹ ولیم کالج سے وابستہ کسی ایک مصنف کا تعارف پیش کیجیے۔

09.09 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو نثر کا ارتقا از شہناز انجم

۲۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات از ڈاکٹر عبیدہ بیگم

09.10 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ۱۸۰۰ء میں قائم ہوا۔

﴿۲﴾ اردو کو ہندی اور ہندوستانی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

﴿۳﴾ جان گلکرسٹ پہلے صدر تھے۔

﴿۴﴾ گنج خوبی

﴿۵﴾ ۱۸۴۳ء میں بنارس میں

﴿۶﴾ گلشنِ ہند

﴿۷﴾ میر امن کا اصل نام میر امان تھا۔

﴿۸﴾ حیدر بخش حیدری کی کتابیں ہیں

﴿۹﴾ فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر کو علمی وژن اور وقار عطا کیا۔

✵

اکائی 10 دہلی کالج

ساخت

10.01 : اغراض ومقاصد
10.02 : تمہید
10.03 : دہلی کالج کا قیام
10.04 : دہلی کالج کے اساتذہ
10.05 : دہلی کالج کے طلبا
10.06 : دہلی کالج کی کتابیں
10.07 : دہلی کالج کی ادبی خدمات
10.08 : خلاصہ
10.09 : فرہنگ
10.10 : نمونہ امتحانی سوالات
10.11 : حوالہ جاتی کتب

10.01 اغراض ومقاصد

یہ اکائی اُردو زبان وادب کے حُسن میں چار چاند لگانے والے ایک اہم اِدارے ''دہلی کالج'' کی رنگا رنگ اور دل موہ لینے والی خوب صورت تصویریں پیش کرتی ہے۔ دہلی کالج نے اُردو زبان ادب کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، وہ آبِ زَر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اِس ادارے نے اَیسے اَیسے لعل و گہر پیدا کیے ہیں جن کی قدر و قیمت کا اَندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا، کیوں کہ جو چیز اَن مول ہو، اُس کی صحیح قدر و قیمت کا اَندازہ لگا پانا اگر محال نہیں تو ناممکن ضرور ہوتا ہے۔ جس طرح سے فورٹ ولیم کالج نے اُردو زبان کے فروغ میں اہم کردار اَدا کیا ہے، یوں ہی دہلی کالج نے بھی اُردو زبان واَدب کے گیسو سنوارنے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اُردو زبان واَدب میں تذکرہ نگاری، ناول نگاری، ترجمہ نگاری اور تنقید نگاری وغیرہ کے جو قد آور فن کار اور اُن کی فن کاری کا جو گنج ہائے گراں مایہ ہمارے پاس موجود ہے، اگر دہلی کالج نہ ہوتا تو شاید اُردو زبان وادب کے گلشن میں اُن رنگا رنگ اور خوش بُو دار پھولوں کا وجود بھی نہیں ہوتا۔

اِس اکائی میں آپ دہلی کالج کے قیام، وہاں کے اساتذہ، طلبا، کتابوں اور ادبی خدمات کا مطالعہ کریں گے۔ آخر میں اکائی کا خلاصہ، مشکل الفاظ کے معانی، امتحان میں پوچھے جانے والے سوالات کے نمونے، حوالہ جاتی کتب کی فہرست اور معروضی سوالات و جوابات کے کچھ نمونے بھی درج کیے گئے ہیں تاکہ آپ کتاب کے مطالعے کے ساتھ ساتھ امتحان کی مشق بھی کرتے رہیں۔

10.02 تمہید

اُردو زبان وادب کی تعمیر وترقی میں دو اِداروں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ا۔فورٹ ولیم کالج ،۲۔ دہلی کالج۔فورٹ ولیم کالج نے اُردو زبان کو فروغ بخشا جب کہ دہلی کالج نے اُردو ادب کو نئی سمت و رفتار عطا کی۔ دونوں اِدارے اپنی اپنی غرض و غایت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں کو ہندوستانی زبانوں کی تعلیم دی جائے تا کہ وہ یہاں کے لوگو(ہندوستانیوں) پر بہ آسانی حکومت کر سکیں۔ اِس لئے اِس کالج کے ذریعے اُردو زبان کو فروغ ملا۔ جب کہ دہلی کالج کے قیام کا مقصد اِس کے برعکس تھا۔ دہلی کالج ہندوستانیوں کو جدید علوم وفنون سے رُوشناس کروانے کے لئے قائم کیا گیا تھا تا کہ وہ نئے زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکیں۔ اِس لئے اِس کالج میں علمی وادبی کتابوں کی ترویج واشاعت پر خصوصی توجہ دی گئی، جس کی وجہ سے اُردو ادب نے ترقی کی نئی نئی منزلیں طے کیں۔ البتہ ایک چیز ایسی تھی جو اِن دونوں اِداروں کو آپس میں جوڑنے کا کام کرتی تھی اور وہ چیز یہ تھی کہ دونوں اِداروں میں درس وتدریس اور تعلیم وتعلم کا ذریعہ ''اُردو زبان'' تھی، یہاں تک کہ فورٹ ولیم کالج میں سائنس، جغرافیہ، ریاضی، انگریزی ادبیات، کیمسٹری، علمِ نجوم اور تاریخ وغیرہ کی تعلیم بھی اُردو زبان میں دی جاتی تھی۔ دہلی کالج نے تصنیف وتالیف اور ترجمہ نگاری کی ایک مضبوط روایت قائم کی اور علم وادب کا ایسا خوش گوار ماحول فراہم کیا کہ دہلی کالج کے سربرآوردہ طلبا نے اِس سلسلے کو آگے بڑھانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی فکری وفنی کاوشوں کے ذریعے اُردو زبان وادب کے پژمردہ اور اُداس چہرے پر مسرت وانبساط کی ایک خوش گوار لہر دوڑا دی۔ ایک ایسی مُسکراہٹ عطا کی جس کی ایک جھلک پانے کی خواہش لیے نہ جانے کتنے ہی دیوانے اُردو زبان وادب کی پاکیزہ گلیوں کے چکر کاٹتے رہتے ہیں اور جو اِس سعی وجستجو میں کام یابی کی منزل سے ہم کنار ہو جاتے ہیں، اُن کے چہرے خوشی ومسرت کی جیتی جاگتی تصویر بن کر نَو آوردگانِ دشتِ وحشت کے لئے سرور وکیف کا سامان فراہم کرتے ہیں، تا کہ جہاں تک ہو سکے وہ بھی اِس سلسلے کو آگے بڑھانے میں اپنا تعاون پیش کر سکیں۔ اِس اکائی میں آپ اُردو زبان وادب میں دہلی کالج کی ایسی ہی علمی وادبی خدمات کی کچھ جھلکیاں دیکھیں گے۔

10.03 دہلی کالج کا قیام

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اگر کسی قوم کو کسی ملک پر ایک طویل مدت تک حکومت کرنی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے افکار ونظریات، دین ومذہب اور تہذیب وتمدن کی تبلیغ اور ترویج واشاعت کا فریضہ بھی انجام دینا ہے تو اُس قوم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے افراد کو اُس ملک کی زبان، ماحول اور تہذیب ومعاشرت سے رُوشناس کرے۔ جب انگریزی قوم نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو اُس کے سامنے کچھ ایسی ہی دشواریاں پیش آئیں، کیوں کہ انگریز ہندوستان کی مقامی زبانوں اور بولیوں سے ناواقف تھے۔ اِس لئے انگریز افسران وملازمین کو ہندوستانی زبانیں سکھانے کے لئے فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس میں داستان، قصے اور کہانیوں کی شکل میں آسان اور عام فہم زبان کی کتابیں لکھوائی گئیں تا کہ اُن کتابوں کی مدد سے انگریز ہندوستانی عوام کی زبان سمجھنے میں کام یاب ہو سکیں۔ جب انگریزی حکومت کے افسران وملازمین نے مقامی زبانوں اور بولیوں سے واقفیت حاصل کر لی اور سرزمینِ ہندوستان پر مضبوطی کے ساتھ اپنے پنجے گاڑ دیے تو اُنہوں نے اپنے افکار ونظریات کی تبلیغ واشاعت کے لئے ایک کالج کی ضرورت محسوس کی، اپنے مقصد کی حصول یابی کے لئے انہوں نے دہلی کالج قائم کیا تا کہ وہ ہندوستان میں مغربی تہذیب وتمدن کو فروغ دے سکیں۔ ذیل میں دہلی کالج کے قیام کی ایک جھلک پیش کی گئی ہے۔

خاندانِ مغلیہ کے چشم و چراغ، شہنشاہِ ہندوستان محی الدین اَورنگ زیب عالم گیر کے ایک جنرل نواب غازی الدین خان فیروز جنگ اول صوبے دار، گجرات کے نام پر ''مدرسہ غازی الدین خان'' کے نام سے ۱۷۰۱ء میں ایک مدرسے کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ جس میں ۱۸۲۴ء تک روایتی علوم وفنون کی درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہا لیکن جب ملک کے حالات خراب ہوئے تو اُس کا اثر مدرسے پر بھی پڑا اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ طلبا کی تعداد صرف ۹ رہ گئی۔ اِس لئے ۱۸۲۵ء میں اِسی مدرسے کی عمارت میں ''دہلی کالج'' کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں یہ کالج بند ہو گیا۔

۱۸۶۴ء میں یہ کالج ایک بار پھر کھلا مگر ناموافق حالات کی وجہ سے ۱۸۷۷ء میں اِسے ''لاہور کالج'' میں ملا دیا گیا۔ جامع اُردو انسائیکلوپیڈیا کے مطابق: ''اب جو دہلی کالج ہے، اُس کی ابتدا یوں ہوئی کہ کالج ختم ہونے کے بعد کچھ اہلِ ثروت نے ۱۸۸۲ء میں ''اینگلو عربک اسکول'' قائم کیا جسے ۱۸۸۴ء میں ''ہائی اسکول'' کا درجہ مل گیا، پھر ۱۹۲۴ء میں ''اینگلو عربک اِنٹر کالج'' اور ۱۹۴۳ء میں ''پوسٹ گریجویٹ کالج'' کا درجہ حاصل ہو گیا۔ تقسیمِ ہند کے بعد ۱۹۴۸ء میں اسی کو ''دہلی کالج'' کا نام دے دیا گیا۔ موجودہ وقت میں یہ کالج ''ذاکر حسین دہلی کالج'' کے نام سے جانا جاتا ہے جو دہلی یونی وَرسٹی کا حصہ ہے۔

10.04 دہلی کالج کے اساتذہ

کسی بھی اِدارے کو اوجِ ثریا تک لے جانے کے لئے ضروری ہے کہ شروع ہی سے اُس کی صحیح سمت کا تعین کیا جائے اور اسی کے مطابق منزل بہ منزل اُس کے سفر کی راہیں طے جائیں مثلاً اگر کسی پودے کو ایک تن آور درخت کی شکل دینی ہو تو پہلے ہی دن سے اُس کی دیکھ بھال کی ذمے داری سنبھالنی پڑے گی، جیسے جیسے وہ پودا بڑا ہوتا جائے گا، اُس کی شاخوں کی کانٹ چھانٹ کرنی پڑے گی، بہ قدرِ ضرورت اُسے کھاد اور پانی کی شکل میں خوراک فراہم کرنی ہوگی اور یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہے گا جب تک وہ پودا ایک تن آور درخت کی صورت نہ اختیار کر لے۔ جب وہ پودا اپنے عروج کی منزل تک رسائی حاصل کر لے گا یعنی درخت کے پیکر میں ڈھل جائے گا تو آپ جس فرحت وانبساط کی کیفیت سے روشناس ہوں گے، اُسے بیان کرنے کے لئے الفاظ ومعانی ناکافی ہوں گے۔ یہی کیفیت کسی ادارے کو قائم کرنے کے بعد اُسے عروج وارتقا کی نئی نئی بلندیوں سے ہم کنار کرنے والے اُس ادارے کے اساتذہ کی بھی ہوتی ہے۔

دہلی کالج کے حُسن کو نکھارنے اور اُس کے رنگ کو مزید گہرا کرنے میں مغربی اور مشرقی دونوں شعبوں کے اساتذہ نے اپنی اپنی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ مغربی شعبے کے اساتذہ میں جوزف ہنری ٹیلر کالج کی انتظامی کمیٹی کے سکریٹری اور سپرنٹنڈنٹ تھے لیکن وہ کالج پر زیادہ توجہ نہیں دے پاتے تھے بلکہ اکثر وبیش تر کالج کے علاوہ دوسرے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ اسی وجہ سے اُن کو دہلی کالج کا پرنسپل نہیں بنایا گیا، حالاں کہ مجلسِ مقامی ۱۸۳۷ء میں انہیں کالج کا پرنسپل بنانے کی تجویز پیش کر چکی تھی۔

۱۸۴۱ء میں مسٹر فیاکس بتروس کو دہلی کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ مسٹر فیاکس بتروس علمی استعداد کے لحاظ سے ایک بہترین انتخاب تھے۔ انہوں نے مغربی علوم وفنون کی ترویج واشاعت کے ساتھ ساتھ دیسی اور مقامی زبان میں ترجمہ نگاری کی روایت قائم کی۔ دہلی ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے قیام اور اُسے بامِ عروج تک پہنچانے میں اُن کا اہم کردار ہے۔ اُن کے بعد ڈاکٹر اسپرنگر کی تقرری ہوئی جو دہلی ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے روحِ رواں تھے اور عربی زبان وادب میں کافی دست رس رکھتے تھے۔ اِس لئے ہر کوئی انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

''تاریخِ یمینی، حماسہ، دیوانِ متنبّی اور شاہانِ اَودھ کے کتب خانے کی فہرست مہیا کرنے میں اُن کا بڑا حصہ رہا ہے۔ڈاکٹر اسپرنگر کے بعد ۱۸۵۰ء میں مسٹر جے. کارگل کو پرنسل کے عہدے کی ذمے داری سونپی گئی اور اُن کے بعد ۱۸۵۴ء میں مسٹر ٹیلر کو پرنسل کا قائم مقام بنایا گیا۔ پروفیسر ایلس کا نام بھی قابلِ ذکر ہے جو انگریزی زبان و ادب کے ایک قابل عالم تھے۔یہ سب مغربی شعبے کی وہ قد آور شخصیات ہیں جنھوں نے طلبا اور کالج دونوں کو متاثر کیا اور دونوں کی تعمیر و ترقی کی راہیں ہموار کیں۔

مشرقی شعبے کے اساتذہ میں مولوی مملوک علی شعبۂ عربی کے صدر مدرس تھے۔یہ اگرچہ عربی شعبے سے وابستہ تھے مگر اُردو، عربی اور فارسی تینوں زبانوں میں ایسی دست گاہ رکھتے تھے کہ ہر وقت طلبا کے حصار میں رہتے تھے۔اُن کے جیسا عالم و فاضل اس زمانے میں شاید ہی کوئی دوسرا رہا ہو۔مگر زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ایسے لائق و فائق انسان کی جیسی قدر و منزلت ہونی چاہیے تھے، ویسی ہوئی نہیں۔انہوں نے ''تحریرِ اقلیدس اور سننِ ترمذی'' کے ترجمے اُردو زبان میں کیے۔

مولوی امام بخش صہبائی شعبۂ فارسی کے صدر مدرس تھے جو فارسی زبان و ادب کے ایک بڑے ادیب کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔اُن کی علمی لیاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُن کی تصنیف کردہ کتابیں دہلی کالج کے نصاب میں شامل تھیں اور اُن کی باقاعدہ درس و تدریس ہوتی تھی۔مولوی امام بخش صہبائی مصنف و مترجم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے، انہوں نے شمس الدین کی ''حدائق البلاغت'' کا اُردو زبان میں ترجمہ کیا نیز ''شعرائے اُردو'' کا ایک انتخاب بھی شائع کیا۔

مولوی سبحان بخش دہلی کالج کے ماہر اور قابل اساتذہ میں سے ایک تھے۔انہوں نے ''تاریخِ ابنِ خلکان'' کا ترجمہ اُردو زبان میں ''وفیات الاعیان'' کے نام سے کیا۔ان کی دوسری تصانیف میں ''تزکِ تیموری کا اُردو ترجمہ، تذکرۂ مفسرین اور تذکرۂ حکما'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ماسٹر وزیر علی اور ماسٹر امیر علی کو بھی دہلی کالج کے بہترین اساتذہ کی فہرست میں شمار کیا جاتا ہے۔ ماسٹر رام چندر دہلی کالج ہی کے ایک ہونہار طالبِ علم تھے جو بعد میں سائنس کے ماسٹر مقرر کیے گئے۔ریاضی کے ایک ماہر استاد کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ یہ سائنس کی تعلیم بھی اُردو زبان میں دیتے تھے۔ڈاکٹر ضیاءالدین، ماسٹر پیارے لال، بھیروں پرشاد اور مولوی ذکاءاللہ بھی اسی کالج سے وابستہ تھے۔

مولوی احمد علی کی ایک تصنیف ''قواعدِ اُردو'' ہے جو چشمۂ فیض'' کے نام سے مشہور ہے۔ میر اشرف علی نے ''تاریخِ کشمیر'' کا ترجمہ فارسی سے اُردو زبان میں کیا۔اس کے علاوہ ''رسالۂ اصولِ حساب'' کی تصنیف میں بابو ہردیو سنگھ کا تعاون کیا، ساتھ ہی ساتھ ''بریف سروے آف ہسٹری'' کی اصلاح بھی کی۔ پنڈت رام کشن دہلوی نے علمِ طب کے ایک رسالے کا انگریزی سے اُردو زبان میں ترجمہ کیا۔''اصولِ قوانینِ دیوانی و فوج داری، اصولِ قانونِ کلکٹری، اصول قوانینِ گورنمنٹ، سیرِ اسلام کے چوتھے باب اور میکناٹن کے اصولِ دَھرم شاستر'' وغیرہ کے ترجمے بھی کیے۔

ماسٹر حسینی نے ''تاریخِ ایران، تاریخِ مغلیہ، میکناٹن کی شرع شریف، قانونِ محمدی فوج داری، قانونِ وراثتِ اسلامی، خلاصۂ قانونِ دیوانی اور قانونِ فوج داری'' وغیرہ کے ترجمے کیے۔ ہردیو سنگھ نے ''رسالۂ پیمائش دو حصوں اور اصولِ حساب'' کے ترجمے کیے۔ ماسٹر نور محمد تحتانی نے ''تاریخِ بنگال'' کا ترجمہ کیا جب کہ ''تاریخِ ایران'' کے ترجمے میں ماسٹر حسینی کے کے شریکِ کار رہے۔مولوی حسن علی خاں نے ''قانونِ مال، گلستانِ سعدیؔ اور کرۂ ارضی'' کے ترجمے کیے جب کہ ''الف لیلہ'' کے منتخب حصوں کا بھی ترجمہ کیا۔

10.05 دہلی کالج کے طلبا

جس طرح ایک شاعر اپنی شاعری کے ذریعے اپنی شناخت قائم کرتا ہے، اسی طرح ایک ادارہ اپنے قابل اور ہنر مند فرزندوں سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ جس طرح کسی بھی ادارے کی شہرت و مقبولیت اور اُس کی عظمت و بلندی میں اساتذہ اور منتظمین وغیرہ کی رات دن کی محنت و مشقت شامل ہوتی ہے، اسی طرح اُس ادارے سے خوشہ چینی کرنے والے طلبا بھی اِس اَمر میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ یہ طلبا ملک میں جہاں بھی جاتے ہیں، اپنے ادارے کی علمی و ادبی خوشبو سے وہاں کے تشنگانِ علم و فن کی مشامِ جاں کو معطر کرتے ہیں۔ آیئے دہلی کالج کے کچھ ایسے ہی ہونہار اور قابل طلبا کے بارے میں جانتے ہیں۔

دہلی کالج کے ہونہار فرزندوں میں ڈپٹی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزادؔ اور خواجہ الطاف حسین حالیؔ وغیرہ کی علمی و ادبی کاوشیں اپنا ایک ممتاز و منفرد مقام و مرتبہ رکھتی ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ نے اخلاق، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، اور طبیعیات وغیرہ پر بے شمار کتابیں تصنیف کیں۔ اگر ان کی تمام تصانیف ایک جگہ جمع کی جائیں تو ایک چھوٹا سا کتب خانہ تیار ہو جائے گا۔ مولوی ضیاء الدین عربی زبان کے پروفیسر تھے۔ ان کی سب سے اہم کتاب ''رسومِ ہند'' ہے جسے کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان سب کا تفصیلی تذکرہ ''دہلی کالج کی ادبی خدمات'' کے تحت کیا گیا ہے۔

ماسٹر رام چندر دہلی کالج کے سب سے ہونہار اور سینئر طالبِ علم تھے۔ اس کے علاوہ ریاضی اور سائنس کے ایک ماہر استاد بھی تھے۔ فنِ ریاضی میں انہوں نے کافی نام کمایا۔ الجبرا اور علمِ مثلث پر اُن کی تصنیف کردہ کتابیں کالج کے نصاب میں شامل تھیں۔ انہوں نے ''فوائد الناظرین'' اور ''محبِ ہند'' نامی دو رسالے بھی جاری کیے جن میں علمی بحثیں ہوتی تھیں۔ ماسٹر رام چندر ایک مشفق و مہربان مدرس بھی تھے۔ طلبا سے بے پناہ محبت و شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ انہیں علمِ ریاضی سے گہرا لگاؤ تھا۔ انہوں نے انگریزی کتابوں کی مدد سے ایک کتاب ''جبر و مقابلہ'' تصنیف کی۔ نیز اصولِ علمِ مثلث بالجبر اور تراش ہائے مخروطی اور علمِ ہندسہ بالجبر میں ایک رسالہ بھی لکھا۔ ان کی ایک کتاب ''کلیات و جزئیات'' کے نام سے بھی شائع ہوئی۔ ان تصانیف کے عوض میں اُن کو انعام و خلعت سے نوازا گیا۔ مسٹر پتمبر دہلی کالج کے ہونہار طلبا میں سے ایک تھے۔ یہ پہلے ایسے دیسی سول انجینئر تھے جن کی تقرری دہلی میں ہوئی۔

موتی لال دہلوی دہلی کالج کے ممتاز طلبا میں سے ایک تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں پر دست رس رکھتے تھے۔ شاعر بھی تھے اور بسملؔ تخلص رکھتے تھے۔ انہوں نے پلوٹارک کے تذکرے ''سسرؤ'' کا اُردو زبان میں ترجمہ کیا۔ تعلیمِ نسواں اور بچپن کی شادی کے متعلق دو رسائل تصنیف کیے نیز مسمریزم کے موضوع پر دو کتابوں کا انگریزی سے اُردو زبان میں ترجمہ کیا۔ بھیروں پرشاد بھی ایک قابل طالبِ علم تھے۔ یہ دہلی کالج سے تعلیم حاصل کر کے وہیں اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے۔ پنڈت من پھول دہلی کالج کے قدیم طلبا میں سے تھے۔ یہ پنجاب گورنمنٹ میں میر منشی کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ ماسٹر پیارے لال وہ طالبِ عالم تھے جنھوں نے ماسٹر رام چندر اور مولوی امام بخش صہبائی کے دسترخوانِ علم و فن سے اپنے حصے کا علمی رزق حاصل کیا۔ یہ مدارس کے انسپکٹر مقرر کیے گئے۔ اُردو، فارسی اور انگریزی میں کافی دست رَس رکھتے تھے۔ اُن کی تصانیف میں ''قصصِ ہند حصہ اول، قصصِ ہند حصہ سوم، رسومِ ہند کا ابتدائی نصف حصہ، تاریخِ انگلستان (کلاں) اور دربارِ قیصری کا ترجمہ'' وغیرہ شامل ہیں۔ ''رسالۂ اتالیق'' کے اکثر و بیش تر مضامین بھی اُنہی کے خامہ فکر کی دین ہیں۔

دہلی کالج ہی کے ایک طالبِ علم شری رام ایم.اے بھی تھے۔ ریاستِ اَلور میں وزیرِ اعظم کے منصب پر سرفراز کیے گئے۔ ایک اور طالبِ علم حکم چند تھے جو اپنی ذہانت و فطانت کے لحاظ سے امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔ ایک طالبِ علم نند کشور تھے جو پنجاب میں انسپکٹر مدارس کے عہدے پر مقرر کیے گئے۔ ماسٹر کیدار ناتھ سیشن جج بنے۔ پیرزادہ محمد حسین بھی سیشن جج ہوئے۔ ''سفرنامۂ ابنِ بطوطہ کا ترجمہ'' اُن کی یادگار ہے۔ خواجہ محمد شفیع بھی دہلی کالج کے ایک ہونہار طالبِ علم تھے۔ میر ناصر علی بھی یہیں کے طالبِ علم تھے جو 'صلائے عام'' کے ایڈیٹر تھے۔

ماسٹر پیارے لال کے چھوٹے بھائی مدن گوپال بھی اسی کالج سے جڑے ہوئے تھے۔ یہ ایک کامیاب بیرسٹر ہوئے۔ انہوں نے پروفیسر جیوانز کی منطق کا اُردو زبان میں ترجمہ کیا۔ ماسٹر جانکی پرشاد بھی ایک ذہین طالبِ علم تھے۔ پنڈت دھرم نرائن کو'' رائے بہادر'' کے خطاب سے نوزا گیا۔ انہوں نے'' پالیٹیکل اِکانمی'' (معاشیات) کا ترجمہ اُردو زبان میں کیا۔ ساتھ ہی'' پالیٹیکل اکانمی'' کا انتخاب'' سیاستِ مدن'' کے نام سے شائع کیا۔ تاریخِ انگلستان کے کچھ حصوں کا ترجمہ بھی اُنہی کے قلم کا مرہونِ منت ہے۔

شیونرائن بھی اسی کالج کے طالبِ علم تھے، انہوں نے اُردو زبان میں ہندوستان کا ایک جغرافیہ لکھا۔ تذکرۂ دیماس تھیبز (پلوٹارک) کا اُردو زبان میں ترجمہ کیا ساتھ ہی سروپ نرائن کے ساتھ مل کر'' رسالۂ علمِ طبیعیات'' کا بھی اُردو زبان میں ترجمہ کیا۔ مولوی کریم الدین بھی دہلی کالج کے ایک ذہین اور ہونہار طالبِ علم تھے۔ ان کی بے شمار تصانیف ہیں جن میں ''تعلیم النسا، گلستانِ ہند، تذکرۂ شعرائے ہند (طبقاتِ شعرائے ہند)، گل دستۂ نازنیناں، تذکرۃ النسا، ترجمۂ ابوالفدا اور تاریخِ شعرائے عرب'' کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان طلبا کے علاوہ پنڈت کاشی ناتھ، آتمارام اور لکشمن داس وغیرہ بھی دہلی کالج ہی کے پروردہ تھے۔

10.06 دہلی کالج کی کتابیں

دہلی کالج تصنیف و تالیف اور ترجمہ نگاری کے لحاظ سے فورٹ ولیم کالج اور اُردو کے دوسرے تمام اِداروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس کالج نے ترجمہ نگاری کی ایک ایسی روایت قائم کی جس نے اُردو زبان و ادب کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ دہلی کالج سے مختلف علوم و فنون مثلاً تاریخ، ریاضی، جغرافیہ، سائنس، قانون، حکمت، کیمسٹری، اکانمی، اسلامی وراثت، لغت، قواعد، ہیئت، بلاغت، شاعری اور بے شمار موضوعات کی طبع زاد اور ترجمہ نگاری کے ذریعے اُردو زبان و ادب کے قالب میں ڈھالی گئی کتابوں کی تعداد ۱۲۸ رہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ تحریر اقلیدس (مقالہ ۱ تا ۶، ۱۱، ۱۲)
۲۔ اصولِ قانون
۳۔ تاریخِ ہند (زمانۂ قدیم تا حال)
۴۔ اصولِ حکمت
۵۔ اصولِ قوانینِ مال گزاری
۶۔ اصولِ قوانینِ اقوام
۷۔ تاریخِ انگلستان (خلاصۂ تاریخِ گولڈ اسمتھ کا ترجمہ)
۸۔ الجبرا (ترجمۂ برجز)
۹۔ علمِ مثلث و تراش ہائے مخروطی
۱۰۔ عملی علمِ ہندسہ (پریکٹیکل جیومیٹری)
۱۱۔ اصولِ علمِ ہیئت (ترجمۂ علمِ ہیئت ہرشل، آٹھ ابواب)
۱۲۔ تاریخِ اسلام
۱۳۔ تاریخِ یونان
۱۴۔ تاریخِ روما
۱۵۔ رسالۂ کیمسٹری (ترجمۂ پارکر)
۱۶۔ استعمالِ آلاتِ ریاضی

۱۷۔ اٹلس (جغرافیہ)
۱۸۔ قواعدِ اُردو
۱۹۔ انتخابِ شعرائے اُردو
۲۰۔ انتخابِ الف لیلہ
۲۱۔ شمسیہ (منطق)
۲۲۔ سراجی (اسلامی قانونِ وراثت)
۲۳۔ ترجمۂ گلستاں
۲۴۔ قانونِ محمدی فوج داری
۲۵۔ اُردو لغات
۲۶۔ قانونِ مال (ترجمۂ مارشمین)
۲۷۔ لیلاوتی (حساب)
۲۸۔ رامائن
۲۹۔ مہابھارت (انتخاب)
۳۰۔ نل دمن
۳۱۔ دیوانِ سودا
۳۲۔ دیوانِ درد
۳۳۔ دیوانِ میر
۳۴۔ دیوانِ جرأت
۳۵۔ نیچرل فلاسفی
۳۶۔ پولیٹیکل اکانمی (معاشیات، ترجمۂ ویلنڈ)
۳۷۔ تحلیلی علمِ ہندسہ
۳۸۔ خلاصۂ شاہ نامہ (اُردو)
۳۹۔ مبادیاتِ تفرقی احصا و تکمیلی احصا
۴۰۔ تاریخِ ایران
۴۱۔ میکانیات (لارڈنر)
۴۲۔ نیچرل تھیالوجی (پیلے)
۴۳۔ تاریخِ اکتشافِ بری و بحری
۴۴۔ محاوراتِ اُردو
۴۵۔ ترجمۂ تزکِ تیموری
۴۶۔ ترجمۂ اسمتھ مورل سینٹی مینٹس
۴۷۔ یوسف خاں کی سیاحتِ یورپ
۴۸۔ جغرافیۂ قدیم کے نسخے
۴۹۔ اصولِ جبر و مقابلہ
۵۰۔ مختصر خاکۂ تاریخِ عالم (دو جلدیں)
۵۱۔ انتخابِ پلوٹارکس لائیوز (مشاہیرِ یونان و روما)
۵۲۔ دھرم شاستر
۵۳۔ شرعِ اسلامی
۵۴۔ سکپ وتھ کا خلاصہ، قانونِ فوج داری
۵۵۔ پرنسپپ کا خلاصۂ قانونِ دیوانی
۵۶۔ خلاصۂ شرعِ اسلامی و دھرم شاستر
۵۷۔ ضابطۂ مال گزاری
۵۸۔ زلیخا
۵۹۔ بدرِ منیر
۶۰۔ لیلیٰ مجنوں
۶۱۔ حدائق البلاغت
۶۲۔ شکنتلا
۶۳۔ سنسکرت اور انگریزی ڈرامے
۶۴۔ رگھوونش (کالی داس کا ڈراما)
۶۵۔ تعلیم نامہ
۶۶۔ جامع الحکایات
۶۷۔ تاج الملوک و بکاؤلی
۶۸۔ اسسٹنٹ مجسٹریٹ گائیڈ
۶۹۔ تاریخِ خاندانِ مغلیہ (تیمور تا شاہ عالم)
۷۰۔ فلسفہ (ایبر کرامبیز مینٹل فلاسفی)

۷۱۔ نگارستان
۷۲۔ تاریخِ چارلس دوازدہم
۷۳۔ جغرافیۂ طبعی (ترجمۂ ٹریل)
۷۴۔ علم و عملِ طب (عربی سے اُردو)
۷۵۔ طبعی نباتیات
۷۶۔ حفظانِ صحت
۷۷۔ عضویات (علمِ افعالِ عضویات)
۷۸۔ علمِ معدنیات
۷۹۔ تذکرۂ حکما
۸۰۔ مساحت (ترجمۂ تھیوڈولک)
۸۱۔ چشمۂ فیض (مختصر قواعدِ اُردو)
۸۲۔ طبیعیات (ترجمۂ اَرناٹ)
۸۳۔ صرف و نحوِ انگریزی (اُردو)
۸۴۔ عملی ساحتِ زمین
۸۵۔ سیکسٹینٹ کا ترجمہ
۸۶۔ ہندوستان کے پیداواری ذرائع (رائل)
۸۷۔ سوانحِ عمری رنجیت سنگھ
۸۸۔ رسالۂ طب
۸۹۔ ترجمۂ ابوالفدا (تین جلدیں))
۹۰۔ تاریخِ کشمیر
۹۱۔ جغرافیۂ ہند
۹۲۔ فرائدالدہر (تاریخِ شعرائے عرب)
۹۳۔ تاریخِ بنگال
۹۴۔ رسالۂ مقناطیس
۹۵۔ تذکرۂ ہندو شعرا
۹۶۔ رسالۂ جراحی (سرجری)
۹۷۔ حرکیات و سکونیات
۹۸۔ ترجمۂ ویبسٹر ز ہائیڈ راسٹالکس
۹۹۔ علم المناظر (ترجمۂ فلپ)
۱۰۰۔ حرارت
۱۰۱۔ ترجمۂ ہائیڈ راسٹالکس
۱۰۲۔ ترجمۂ ڈبل ریفریکشن اینڈ پولرائزیشن...
۱۰۳۔ رسالۂ علمِ برق (ترجمۂ زاجٹ)
۱۰۴۔ گالون ازم
۱۰۵۔ حکمائے یونان
۱۰۶۔ حالاتِ ہندوستان
۱۰۷۔ ہدایۃ المبتدی
۱۰۸۔ مزید الاموال باصلاحِ الاحوال
۱۰۹۔ رسالۂ اصولِ حساب (ترجمۂ ڈی مورگن)
۱۱۰۔ ترجمۂ تاریخ الحکما، تذکرۃ المفسرین......
۱۱۱۔ تذکرۂ شعرائے ہند
۱۱۲۔ رسالۂ طب (انگریزی سے)
۱۱۳۔ تذکرۃ الکاملین
۱۱۴۔ سننِ ترمذی (اُردو)
۱۱۵۔ رسالۂ ربون شادر اثباتِ وجودِ باری
۱۱۶۔ قصۂ چہار درویش معروف بہ باغ و بہار
۱۱۷۔ قصۂ یوسف سلیمانی
۱۱۸۔ تذکرۂ سکندرِ اعظم
۱۱۹۔ رسالۂ احکام الایمان
۱۲۰۔ تاریخِ مسعودی
۱۲۱۔ رسالۂ مرایا مناظر (برشل)
۱۲۲۔ تذکرۂ سسرو

۱۲۳۔ مختصرِ قدوری ۱۲۴۔ تاریخِ یمینی
۱۲۵۔ کلیلہ و دمنہ ۱۲۶۔ احوال المفسرین (عبدالرحمٰن سیوطی)
۱۲۷۔ تذکرۂ ڈلموستینیز ۱۲۸۔ فوائدالافکار فی اعمال الفرجا

(ماخوذ از مرحوم دہلی کالج، مولوی عبدالحق ۱۹۶۲ء)

10.07 دہلی کالج کی ادبی خدمات

انگریز اِس بات کے خواہش مند تھے کہ ہندوستان کی نئی نسل مغربی علوم وفنون سے رُوشناس ہو، کیوں کہ ہندوستان کے باشندوں کو مغربی تہذیب وتمدن کے رنگ میں رنگنے کے لئے اِس سے بہتر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا۔ اِس لئے دہلی کالج میں انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔ اگر چہ انگریزی زبان کی تعلیم کو بنیادی حیثیت حاصل تھی مگر عربی، فارسی، سنسکرت، ریاضی، ہیئت، جغرافیہ اور سائنس وغیرہ کی تعلیم اُردو زبان میں دی جاتی تھی۔ فورٹ ولیم کالج نے جو زبان فراہم کی تھی، وہ جدید تقاضوں کا بوجھ اُٹھانے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔ اُردو زبان کو عصری تقاضوں کے پیکر میں ڈھالنے کا کام دہلی کالج نے کیا۔ دہلی کالج نے فقط اُردو زبان ہی کو مالا مال نہیں کیا بلکہ اِس کالج نے ایسے ایسے فن کار مہیا کیے جو آسمانِ اُردو ادب پر آفتاب وماہ تاب بن کر جگمگائے اور پوری اُردو دنیا کو اپنی روشنی سے روشن وتاب ناک بنا دیا۔ دہلی کالج ہی کے تحت ''ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی'' کا قیام عمل میں آیا، جہاں سے اُردو زبان وادب کی تقریباً ۱۲۸ر کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی۔ اگر اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی دہلی کالج کی خدمات فورٹ ولیم کالج کی خدمات سے کہیں زیادہ ہیں۔

مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل ڈاکٹر اسپرنگر جو عربی زبان وادب کے ایک جید عالم تھے۔ دہلی کالج کی ادبی خدمات میں اُن کا نام سرِ فہرست ہے۔ اُنہی کی تجویز پر دہلی کالج سے ''قران السعدین'' نامی مجلّہ جاری کیا گیا، ساتھ ہی ساتھ ''صحیح بخاری، حماسہ، بہارِ عجم اور آثار الصنادید'' وغیرہ کی اشاعت بھی عمل میں آئی۔ ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے تحت ''رامائن، مہابھارت، دھرم شاستر، لیلاوتی، شکنتلا، رگھوونش، بدرِ منیر، تاج الملوک وبکاؤلی، جامع الحکایات، کلیلہ ودمنہ، قصۂ چہار درویش اور تذکرۂ شعرائے ہند'' جیسی ادبی کتابوں کے اُردو زبان میں ترجمے کیے گئے، ساتھ ہی ساتھ ''میرزا محمد رفیع سوداؔ، میر تقی میرؔ، خواجہ میر دردؔ اور شیخ قلندر بخش جراُتؔ وغیرہ کے دوَاوین'' کو مرتب کر کے شائع کیا گیا۔ ''تاریخِ اسلام، تاریخِ ہند، تاریخِ ایران، تاریخِ یونان وروما، تاریخِ خاندانِ مغلیہ اور تاریخِ کشمیر'' جیسی تاریخی کتابیں تصنیف وتالیف کر کے شائع کی گئیں۔

دہلی کالج نے اُردو زبان وادب کو ایسے ایسے فن کار عطا کیے جنھوں نے اپنی فکری کاوشوں سے اُردو زبان وادب کو نئی نئی بلندیوں سے آشنا کیا۔ مثلاً ڈپٹی نذیر احمد جنھوں نے دہلی کالج ہی میں عربی، فارسی اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ جہاں اُن کے ہم سبق خواجہ الطاف حسین حالیؔ، مولانا محمد حسین آزادؔ، مولوی کریم الدین، مولوی ذکاءاللہ اور ماسٹر پیارے لال آشوبؔ جیسے لوگ تھے۔ انہوں نے ''انڈین پینل کوڈ'' کا ترجمہ ''تعزیراتِ ہند'' کے نام سے کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کو اُردو کا پہلا ناول نگار جب کہ اُن کے ناول ''مرأۃ العروس'' کو اُردو کا پہلا ناول ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اُن کی تصانیف میں ''بنات النعش، رویائے صادقہ، ایامیٰ، توبۃ النصوح، ابن الوقت، منتخب الحکایات، ترجمۂ قرآن، اُمہات الامّہ اور مبادی الحکمت'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ خواجہ الطاف حسین حالیؔ بھی دہلی کالج ہی کے پروردہ تھے۔ شاعری میں مرزا غالبؔ کی

شاگردی اختیار کی اور اُنہی سے اپنی غزلوں کی اصلاح کروائی۔ ''مسدّس مد و جزرِ اسلام، چپ کی داد، برکھا رُت اور مناجاتِ بیوہ'' وغیرہ اُن کی شاعری کے عمدہ نمونے ہیں۔اُن کی تصانیف میں ''یادگارِ غالبؔ، حیاتِ سعدیؔ، حیاتِ جاوید اور مجالس النسا'' وغیرہ اہم ہیں۔خواجہ الطاف حسین حالیؔ کو اُردو کا پہلا تنقید نگار جب کہ اُن کی مایہ ناز کتاب ''مقدمۂ شعر و شاعری'' کو اُردو تنقید کا اولین منشور ہونے کا شرف حاصل ہے۔

اِسی طرح مولانا محمد حسین آزادؔ بھی دہلی کالج ہی سے وابستہ تھے۔اُن کی اہم تصانیف میں ''نیرنگِ خیال، سخن دانِ فارس، سیرِ ایران، خم کدۂ آزادؔ، قصص الہند، دربارِ اکبری اور نگارستانِ فارس'' وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفرؔ کے اوّلین استاد شیخ ابراہیم ذوقؔ کے دیوان کو ترتیب دینے کا سہرا بھی مولانا محمد حسین آزادؔ ہی کے سر سجتا ہے۔مولانا محمد حسین آزادؔ کی سب سے مشہور و مقبول تصنیف ''آبِ حیات'' ہے جسے تذکرہ بھی کہہ سکتے ہیں اور اُردو شاعری کی تاریخ بھی۔یہ کتاب پانچ اَدوار پر مشتمل ہے۔

دہلی کالج کے ہونہار فرزندوں میں ایک اہم نام شمس العلما مولوی ذکاءاللہ کا ہے۔مولوی ذکاءاللہ عربی اور فارسی کے علاوہ ریاضی پر بھی اچھی خاصی دَست رس رکھتے تھے۔انہوں نے اپنی پوری زندگی تصنیف و تالیف میں گزاری۔ادب، سیاست، تاریخ، جغرافیہ، ریاضیات، اقتصادیات، معاشیات، طبعیات اور اخلاقیات وغیرہ پر تقریباً ڈیڑھ سَو کتابیں تصنیف کیں۔اُن کی سب سے مشہور و مقبول کتاب ''تاریخِ ہند'' ہے جو دَس جلدوں پر مشتمل ہے۔

ماسٹر رام چندر دہلی کالج میں ریاضی اور سائنس کے ایک ماہر استاد تھے۔فنِ ریاضی میں انہوں نے کافی نام کمایا۔'الجبرا اور علمِ مثلث' پر اُن کی تصنیف کردہ کتابیں کالج کے نصاب میں شامل تھیں۔انہوں نے ''فوائد الناظرین'' اور ''محبِ ہند'' نامی دو رسالے جاری کیے جن میں علمی بحثیں ہوتی تھیں۔انہیں علمِ ریاضی سے گہرا لگاؤ تھا۔انہوں نے انگریزی کتابوں کی مدد سے ایک کتاب ''جبر و مقابلہ'' تصنیف کی۔نیز اصولِ علمِ مثلث بالجبر اور تراش ہائے مخروطی اور علمِ ہندسہ بالجبر میں ایک رسالہ لکھا۔ان کی ایک کتاب ''کلیات و جزئیات'' کے نام سے بھی شائع ہوئی۔ان تصانیف کے عوض میں اُن کو انعام و خلعت سے نوازا گیا۔

مسٹر پتمبر دہلی کالج کے ہونہار طلبا میں سے ایک تھے۔یہ پہلے ایسے دیسی سول انجینئر تھے جن کی تقرری دہلی میں ہوئی۔موتی لال دہلوی دہلی کالج کے ممتاز طلبا میں سے ایک تھے۔اُردو اور فارسی دونوں زبانوں پر دست رس رکھتے تھے۔شاعر بھی تھے اور بسملؔ تخلص رکھتے تھے۔انہوں نے پلوٹارک کے تذکرے ''سسرو'' کا اُردو زبان میں ترجمہ کیا۔تعلیمِ نسواں اور بچپن کی شادی کے متعلق دو رسائل تصنیف کیے نیز ''مسمریزم'' کے موضوع پر دو کتابوں کا انگریزی سے اُردو زبان میں ترجمہ کیا۔بھیروں پرشاد بھی ایک قابل طالبِ علم تھے۔یہ دہلی کالج سے تعلیم حاصل کر کے وہیں اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے۔پنڈت من پھول دہلی کالج کے قدیم طلبا میں سے تھے۔یہ پنجاب گورنمنٹ میں میر منشی کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ماسٹر پیارے لال وہ طالبِ عالم تھے جنہوں نے ماسٹر رام چندر اور مولوی امام بخش صہبائی کے دسترخوانِ علم و فن سے اپنے حصے کا علمی رزق حاصل کیا۔یہ مدارس کے انسپکٹر مقرر کیے گئے۔اُردو، فارسی اور انگریزی میں کافی دست رس رکھتے تھے۔اُن کی تصانیف میں ''قصصِ ہند حصہ اول، قصصِ ہند حصہ سوم، رسومِ ہند کا ابتدائی نصف حصہ، تاریخِ انگلستان (کلاں) اور دربارِ قیصری کا ترجمہ'' وغیرہ شامل ہیں۔''رسالۂ اتالیق'' کے اکثر و بیش تر مضامین بھی اُنہی کے خامہ و فکر کی دین ہیں۔

دہلی کالج ہی کے ایک طالبِ علم شری رام ایم.اے بھی تھے جو ریاستِ اَلور میں وزیرِ اعظم کے منصب پر سرفراز کیے گئے۔ایک اور طالبِ علم حکم چند نام کے تھے جو اپنی ذہانت و فطانت کے لحاظ سے امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔ایک طالبِ علم نند کشور تھے جو پنجاب میں انسپکٹر مدارس کے عہدے پر مقرر کیے گئے۔ماسٹر کیدار ناتھ سیشن جج بنے۔پیرزادہ محمد حسین بھی سیشن جج ہوئے۔''سفر نامۂ ابنِ بطوطہ کا ترجمہ'' اُن کی یادگار ہے۔

خواجہ محمد شفیع بھی دہلی کالج کے ایک ہونہار طالبِ علم تھے۔میر ناصر علی بھی یہیں کے طالبِ علم تھے جو''صلائے عام'' کے ایڈیٹر تھے۔ ماسٹر پیارے لال کے چھوٹے بھائی مدن گوپال بھی اسی کالج سے جڑے ہوئے تھے،یہ ایک کام یاب بیرسٹر ہوئے۔انہوں نے پروفیسر جیوانز کی منطق کا اُردو زبان میں ترجمہ کیا۔ماسٹر جانکی پرشاد بھی ایک ذہین طالبِ علم تھے۔پنڈت دھرم نرائن کو''رائے بہادر'' کے خطاب سے نوزا گیا۔انہوں نے''پالیٹیکل اکانمی''(معاشیات) کا ترجمہ اُردو زبان میں کیا۔ساتھ ہی''پالیٹیکل اکانمی'' کا انتخاب''سیاستِ مدن'' کے نام سے شائع کیا۔تاریخِ انگلستان کے کچھ حصوں کا ترجمہ بھی اُنہی کے قلم کا مرہونِ منت ہے۔

شیو نرائن بھی اسی کالج کے طالبِ علم تھے،انہوں نے اُردو زبان میں ہندوستان کا ایک جغرافیہ لکھا۔تذکرۂ دیماس تھینیز (پلوٹارک) کا اُردو زبان میں ترجمہ کیا،ساتھ ہی سروپ نرائن کے ساتھ مل کر''رسالۂ علمِ طبیعیات'' کا اُردو زبان میں ترجمہ کیا۔مولوی کریم الدین بھی دہلی کالج کے ایک ذہین اور ہونہار طالبِ علم تھے۔ان کی بے شمار تصانیف ہیں۔یہ دہلی کالج کے''کثیر التصانیف'' افراد میں سرِ فہرست ہیں۔ان کی تصانیف میں''تعلیم النسا،گلستانِ ہند،تذکرۂ شعرائے ہند(طبقاتِ شعرائے ہند)،گل دستۂ نازنیناں،تذکرۃ النسا،ترجمۂ ابوالفدا اور تاریخِ شعرائے عرب'' کافی اہمیت کی حامل کتابیں ہیں۔ان طلبا کے علاوہ پنڈت کاشی ناتھ،آتما رام اور لکشمن داس وغیرہ بھی دہلی کالج سے وابستہ تھے اور انہوں نے بھی اپنی فکری و فنی کاوشوں سے دہلی کالج کی ترقی میں بھرپور حصہ لیا۔

10.08 خلاصہ

خاندانِ مغلیہ کے چشم و چراغ،شہنشاہِ ہندوستان محی الدین اَورنگ زیب عالم گیر کے ایک جنرل نواب غازی الدین خان فیروز جنگ اول صوبے دار،گجرات کے نام پر''مدرسہ غازی الدین خان'' کے نام سے ۱۶۹۲ء میں ایک مدرسے کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔جس میں ۱۸۲۴ء تک روایتی علوم و فنون کی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا لیکن جب ملک کے حالات خراب ہوئے تو اُس کا اثر مدرسے پر بھی پڑا اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ طلبا کی تعداد صرف ۹/رہ گئی۔اِس لئے ۱۸۲۵ء میں اِسی مدرسے کی عمارت میں''دہلی کالج'' کا قیام عمل میں آیا۔۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں یہ کالج بند ہو گیا۔۱۸۶۴ء میں یہ کالج ایک بار پھر کھلا مگر ناموافق حالات کی وجہ سے ۱۸۷۷ء میں اِسے''لاہور کالج'' میں ملا دیا گیا۔

جامع اُردو انسائیکلو پیڈیا کے مطابق:''اب جو دہلی کالج ہے،اُس کی ابتدا یوں ہوئی کہ کالج ختم ہونے کے بعد کچھ اہلِ ثروت نے ۱۸۸۲ء میں''اینگلو عربک اسکول'' قائم کیا جسے ۱۸۸۴ء میں''ہائی اسکول'' کا درجہ مل گیا،پھر ۱۹۲۴ء میں''اینگلو عربک اِنٹر کالج'' اور ۱۹۴۳ء میں ''پوسٹ گریجویٹ کالج'' کا درجہ حاصل ہو گیا۔تقسیمِ ہند کے بعد ۱۹۴۸ء میں اسی کو''دہلی کالج'' کا نام دے دیا گیا۔موجودہ وقت میں یہ کالج ''ذاکر حسین دہلی کالج'' کے نام سے جانا جاتا ہے جو دہلی یونی وَرسٹی کا حصہ ہے۔

دہلی کالج کے حُسن کو نکھارنے اور اُس کے رنگ کو مزید گہرا کرنے میں مغربی اور مشرقی دونوں شعبوں کے اساتذہ نے اپنی اپنی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ مغربی شعبے کے اساتذہ میں جوزف ہنری ٹیلر کالج کی انتظامی کمیٹی کے سکریٹری اور سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ۱۸۴۱ء میں مسٹر فیاکس بتروس کو دہلی کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ مسٹر فیاکس بتروس علمی استعداد کے لحاظ سے ایک بہترین انتخاب تھے۔ اُن کے بعد ڈاکٹر اسپرنگر کو پرنسپل کے عہدے پر مامور کیا گیا جو دہلی ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے روحِ رواں تھے اور عربی زبان و ادب میں کافی دست رَس رکھتے تھے۔ ڈاکٹر اسپرنگر کے بعد ۱۸۵۰ء میں مسٹر جے. کارگل کو پرنسل کے عہدے کی ذمے داری سونپی گئی اور اُن کے بعد ۱۸۵۴ء میں مسٹر ٹیلر کو پرنسل کا قائم مقام بنایا گیا۔ پروفیسر ایلس کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔

مشرقی شعبے کے اساتذہ میں مولوی مملوک علی شعبۂ عربی کے صدر مدرس تھے۔ مولوی امام بخش صہبائی شعبۂ فارسی کے صدر مدرس تھے۔ مولوی سبحان بخش دہلی کالج کے ماہر اور قابل اساتذہ میں سے ایک تھے۔ ماسٹر وزیر علی اور ماسٹر امیر علی بھی دہلی کالج کے بہترین اساتذہ کی فہرست میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ماسٹر رام چندر دہلی کالج ہی کے ایک ہونہار طالبِ علم تھے جو بعد میں سائنس کے ماسٹر مقرر کیے گئے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین، ماسٹر پیارے لال، بھیروں پرشاد، مولوی ذکاءاللہ، مولوی احمد علی، میر اشرف علی، پنڈت رام کشن دہلوی، ماسٹر حسینی، ہردیو سنگھ، ماسٹر نور محمد تحتانی اور مولوی حسن علی خاں وغیرہ بھی اسی کالج سے وابستہ تھے۔

دہلی کالج کے ہونہار فرزندوں میں ڈپٹی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزادؔ، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، مولوی ذکاءاللہ، مولوی ضیاء الدین، ماسٹر رام چندر، مسٹر پتمبر، موتی لال دہلوی، بھیروں پرشاد، پنڈت من پھول، ماسٹر پیارے لال، شری رام ایم.اے، حکم چند، نند کشور، ماسٹر کیدار ناتھ، پیرزادہ محمد حسین، خواجہ محمد شفیع، میر ناصر علی، ماسٹر پیارے لال کے چھوٹے بھائی مدن گوپال، ماسٹر جانکی پرشاد، پنڈت دھرم نرائن، شیونرائن، سروپ نرائن، مولوی کریم الدین، پنڈت کاشی ناتھ، آتما رام اور لکشمن داس وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

دہلی کالج کے تحت ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جہاں سے مختلف علوم وفنون مثلاً ''تاریخ، جغرافیہ، ہیئت، ریاضی، قانون، کیمسٹری، الجبرا اور جیومیٹری'' وغیرہ کی تقریباً ۱۲۸ طبع زاد اور ترجمہ شدہ کتابیں شائع ہوئیں۔ دہلی کالج نے اُردو زبان و ادب کے فروغ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور اُردو زبان و ادب کو دنیا کی دیگر زبانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی جو جرأت و ہمت عطا کی ہے، اس کی مثال دُور دُور تک نظر نہیں آتی۔ دہلی کالج کی اِن تمام خدمات کو کسی بھی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو زبان و ادب کا مؤرّخ جب بھی اُردو زبان و ادب کی تاریخ رقم کرے گا تو دہلی کالج کی ادبی خدمات کو سنہرے حرفوں میں بیان کرے گا۔

10.09 فرہنگ

آلات	: آلہ کی جمع، اَوزار	سمت ورفتار	: مُراد صحیح راستہ
استعداد	: قابلیت	سیاحت	: گھومنا، پھرنا
افکار	: فکر کی جمع، خیالات	شناخت	: پہچان
اکتشاف	: نئی تحقیق	عروج	: بلندی
انبساط	: سُرور	غایت	: مطلب، انتہا

اہلِ ثروت : مال دار لوگ
بدیہی : واضح، ظاہر
برعکس : اُلٹا
بندوبست : انتظام وانصرام
بیش بہا : نہایت قیمتی
پژمُردہ : مُرجھایا ہوا
پروردہ : پالا ہوا
ترویج : رواج دینا
تشنگانِ علم : مُراد طلبا
تعلیم وتعلم : سیکھنا، سکھانا
تمدن : شائستگی
تن آور : بڑے قد والا
جستجو : تلاش
حدائق : حدیقہ کی جمع، باغات
حصار : گھیرا
خلاصہ : ماحصل
خلعت : شاہی انعام (دستار، جامہ، کمربند)
خوش گوار : دل پذیر
خوشہ چینی : فائدہ اُٹھانا
درس وتدریس : پڑھنا، پڑھانا
دَست رس : گرفت
دَست گاہ : دخل
رنگارنگ : مختلف رنگوں والا
روحِ رواں : سب کچھ
رُوشناس : واقف
غرض : مقصد
فروغ : ترقی، بڑھاوا
فریضہ : ذمے داری
فوقیت : برتری
قدآور : بلندرتبہ
قدر : عزت
قصص : قصہ کی جمع، کہانیاں
گراں مایہ : بیش قیمت
گنج : خزانہ
لعل وگہر : مُراد ہونہار طلبا
لغات : لغت کی جمع، معانی کی کتاب
مال گزاری : خراج وصول کرنے کا کام
محال : جو ناممکن ہو
مرہونِ منت : ممنون، احسان مند
مسرت : خوشی
مشامِ جاں : دماغ
معاشرت : مل جل کر زندگی گزارنا
معطر : خوش بُو دار
ممتاز : نمایاں
منتظمین : دیکھ بھال کرنے والے
ناکافی : جو کافی نہ ہو
ناموافق : مخالف
نَوآورد : نیا آنے والا
نوبت : حالت
نیچرل : فطری

ستم ظریفی	: ظرافت کی آڑ میں ستم کرنا	ہم وَار	: برابر
سربرآوردہ	: سردار، نمائندہ	ہنر مند	: لائق
سعی	: کوشش	ہونہار	: قابل

10.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : دہلی کالج کے کم اَز کم ۱۵/ طلبا کے نام لکھیے؟

سوال نمبر۲ : دہلی کالج کی کم اَز کم ۲۰/ کتابوں کے نام قلم بند کیجیے؟

سوال نمبر۳ : دہلی کالج کے کم اَز کم ۱۰/ اساتذہ کے نام سپردِ قرطاس کیجیے؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : ماسٹر رام چندر کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۲ : ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی پر ایک مضمون لکھیے۔

سوال نمبر۳ : دہلی کالج کے بارے میں اپنی معلومات پر روشنی ڈالیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : دہلی کالج کا قیام کب عمل میں آیا؟

(الف) ۱۸۲۵ء میں (ب) ۱۸۳۵ء میں (ج) ۱۸۴۵ء میں (د) ۱۸۱۵ء میں

سوال نمبر۲ : وَرناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے روحِ رواں کون تھے؟

(الف) جان گلکرسٹ (ب) ڈاکٹر اِسپرنگر (ج) ماسٹر رام چندر (د) ماسٹر کیدار ناتھ

سوال نمبر۳ : دہلی کالج میں شعبۂ عربی کے صدر مدرس کون تھے؟

(الف) میر امّن (ب) حیدر بخش حیدری (ج) مولوی مملوک علی (د) مولوی سبحان بخش

سوال نمبر۴ : رسالہ ''فوائدالناظرین'' کس نے جاری کیا؟

(الف) شبلی نعمانی (ب) میر ناصر علی (ج) مولوی مملوک علی (د) ماسٹر رام چندر

سوال نمبر۵ : دہلی کالج میں شعبۂ فارسی کے صدر مدرس کون تھے؟

(الف) مولوی امام بخش صہبائی (ب) مولوی مملوک علی (ج) حیدر بخش حیدری (د) مولوی سبحان بخش

سوال نمبر۶ : ''کلیات وجزئیات'' کس کی تصنیف ہے؟

(الف) ماسٹر رام چندر (ب) جے.کارگل (ج) مدن گوپال (د) ماسٹر پیارے لال

سوال نمبر۷ : ''تذکرۂ شعرائے ہند'' کا تعلق کس ادارے سے ہے؟

(الف) فورٹ ولیم پنجاب (ب) دہلی کالج (ج) دونوں سے (د) کسی سے نہیں

سوال نمبر۸ : ''قواعدِ اُردو'' کے مصنف کا نام کیا ہے؟

(الف) سید فاضل حسین (ب) میر ناصر علی (ج) مولوی احمد علی (د) ماسٹر امیر احمد

سوال نمبر۹ : ''صلائے عام'' کے ایڈیٹر کون تھے؟

(الف) عبدالرزاق (ب) احتشام حسین (ج) مولوی عبدالحق (د) میر ناصر علی

سوال نمبر۱۰ : ''قصصِ ہند حصہ اول'' کس کی تصنیف ہے؟

(الف) ماسٹر پیارے لال (ب) ماسٹر رام چندر (ج) مولوی احمد علی (د) دَھرم نرائن

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (الف) ۱۸۲۵ء میں

جواب نمبر۲ : (ب) ڈاکٹر اِسپرنگر

جواب نمبر۳ : (ج) مولوی مملوک علی

جواب نمبر۴ : (د) ماسٹر رام چندر

جواب نمبر۵ : (الف) مولوی امام بخش صہبائی

جواب نمبر۶ : (الف) ماسٹر رام چندر

جواب نمبر۷ : (ب) دہلی کالج

جواب نمبر۸ : (ج) مولوی احمد علی

جواب نمبر۹ : (د) میر ناصر علی

جواب نمبر۱۰ : (الف) ماسٹر پیارے لال

10.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ دلی کالج اُردو میگزین، قدیم دلی کالج نمبر از خواجہ احمد فاروقی

۲۔ دلی کالج میگزین، دلی نمبر از سید مظفر علی

۳۔ ماسٹر رام چندر از صدیق الرحمٰن قدوائی

۴۔ مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق

۵۔ قدیم دلی کالج از مالک رام

۶۔ اُردو..کے ارتقا میں...رجحانوں کا حصہ از ڈاکٹر منظر اعظمی

۷۔ اُردو ادب کی تحریکیں از ڈاکٹر انور سدید

۸۔ قدیم دہلی کالج کا کردار از شمس الہدیٰ دریا آبادی

۹۔ دلی کالج تاریخ اور کارنامے از ڈاکٹر عبدالوہاب

۱۰۔ دلی کالج از مرزا محمود بیگ

۱۱۔ اینگلو عربک کالج، دہلی از سراج الدین احمد

اکائی 11 فورٹ سینٹ جارج کالج

ساخت

11.01 : اغراض ومقاصد
11.02 : تمہید
11.03 : ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستان میں آمد
11.04 : فورٹ سینٹ جارج کالج کی تعمیر
11.05 : فورٹ سینٹ جارج کے قیام کے اہم مقاصد
11.06 : فورٹ سینٹ جارج کالج کے اہم مصنّفین
11.07 : خلاصہ
11.08 : فرہنگ
11.09 : نمونہ امتحانی سوالات
11.10 : حوالہ جاتی کتب
11.11 : اپنے مطالعے کے جانچ کے جوابات
11.12 : معروضی سوالات کے جوابات

11.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ درج ذیل چیزوں کا مطالعہ حاصل کریں گے:

﴿۱﴾ ایسٹ انڈیا کمپنی کے متعلق مختصر معلومات پیش کی جائے گی۔

﴿۲﴾ کالج کے قیام کے ساتھ ساتھ اس کے اغراضِ مقاصد کے متعلق تفصیلی معلومات پیش کی جائے گی۔

﴿۳﴾ اُردو ادب کے فروغ میں فورٹ سینٹ جارج کالج کی بیش بہا خدمات کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

11.02 تمہید

ملکِ ہندوستان زمانۂ قدیم سے ہی تعلیم وتمدّن کا گہوارہ رہا ہے۔اس کا ماضی اپنی تہذیب،تمدن،ثقافت اور تعلیم کے لحاظ سے بہت ہی شاندار رہا ہے۔ہمارے ملک میں قدیم زمانے سے ہی نالندہ یونیورسٹی،تکشلا یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ دکن کے مشہور بدھ مَت کے مشہور عالم ناگارجنا کی خانقاہ وغیرہ کو بھی علمی وادبی مقبولیت حاصل تھی۔ان یونیورسٹی میں دنیا کے ہر خطے سے خاص طور پر مشرقی ومغربی ایشیا سے بے شمار طالب علم اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لیے آتے تھے۔اس میں دو چینی سیاح فاہیان(Faxian)،ہیونگ سانگ(Xuanzang)،مسعودی

اورالبیرونی(Al-Biruni) کے نام قابل ذکر ہیں۔ابوریحان البیرونی نے ہندوستان میں ہی تعلیم حاصل کی تھی اور یہیں پر درس وتدریس کی خدمات انجام دیں ۔ ہندوؤں کے مقدس قدیمی شہر بنارس کے متعدد پنڈتوں نے اس کو وِدّیا ساگر(Vidya Sagar) یعنی بحرالعلوم کے خطاب سے نوازا تھا۔اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں کہ انگریزی حکومت نے ہندوستان میں جبروتشدد کی کوئی کسر نہیں اٹھارکھی تھی ان سب کے ساتھ ساتھ ہندوستانی علوم وفنون کا زریں ورثہ برطانیہ میں پہنچانے کا کام انجام دیا۔انگریزی حکومت نے علمی میدان میں قابل قدرخدمات انجام دیں جس میں فورٹ ولیم کالج اورسینٹ جارج کالج کا نام سرِ فہرست شمار کیا جاتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ نالندہ اورتکشلا یونیورسٹیوں میں کس خطۂ ارض کے طلبا کی تعداد زیادہ تھی؟

﴿۲﴾ فاہیان کس ملک کا رہنے والا تھا؟

﴿۳﴾ ہیونگ سانگ کس ملک کا باشندہ تھا؟

﴿۴﴾ البیرونی کوکس علم میں مہارت تامہ حاصل تھی؟

﴿۵﴾ ہندومذہب کے مقدم وقدیمی شہر بنارس کے پنڈتوں نے کس عالم کو وِدّیا ساگر کے خطاب سے نوازہ تھا؟

﴿۶﴾ وِدّیا ساگر کا کیا معنی ہوتا ہے؟

11.03 ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستان میں آمد

لندن کی مہارانی الیزہ بیتھ اوّل(Elizabeth I) نے ایک رائل چارٹر(Royal Charte) کے نفاذ کا حکم نامہ صادر فرمایا۔اس کے ذریعہ گورنراورتجارتی کمپنیوں کو مشرقی ممالک میں تجارت کرنے کے اختیارات(Rights) فراہم کیے گیے تھے۔اس کے بعد متعدد کمپنیاں دنیا کے مختلف خطوں میں تجارت کرنے کی غرض سے نکل پڑیں۔انہیں کمپنیوں میں سے ایک کمپنی کا نام ایسٹ انڈیا کمپنی تھا۔ہندوستان میں اس کا قیام ۱۶۰۰ء میں عمل میں آیا۔اس کمپنی کو انگریزی حکومت کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔مؤرخ اِسمتھ کے مطابق ۱۶۰۰ء میں کپتان ولیم ہاکنس (Chaptain William Hawkins) کے ذریعہ مغل بادشاہ جہاں گیر کے پاس سفارتی درخواست بھیجی لیکن شہنشاہ کی جانب سے درخواست کو مسترد کردیا گیا۔۱۶۱۶ء میں ٹامس ایڈورتھ کی سرکردگی میں دوسری مرتبہ سفارت شہنشاہ جہاں گیر کی خدمت میں پیش کی گئی اس مرتبہ اسے منظور کرلیا گیا جس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کو مغربی ساحل کی سب سے خوب صورت بندرگاہ میں ایک کوٹھی بطور تجارت دے دی گئی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۷﴾ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے لائل چارٹر کس ملکہ نے جاری کیا تھا؟

﴿۸﴾ ہمارے ملک ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام کس سن عیسوی میں عمل میں آیا؟

﴿۹﴾ ہندوستان میں تجارتی فرماں واجازت حاصل کرنے کے لیے کس بادشاہ کے دربار میں درخواست بھیجی گئی تھی؟

﴿۱۰﴾ ہندوستان میں تجارتی فرمان واجازت حاصل کرنے کے لیے دوسری مرتبہ کس کے ذریعہ درخواست بھجی گئی تھی جس کو بادشاہ نے قبول کرلیا تھا؟

11.04 فورٹ سینٹ جارج کالج کی تعمیر

راجہ چندر گیری سے سالانہ پٹہ پر چیناپٹن (موجودہ مدراس) میں حاصل زمین پر ۱۳ اپریل ۱۶۴۰ء میں قلعہ بند کوٹھی کی تعمیر کا آغاز ہوتا ہے۔ چوں کہ یہ تعمیر سینٹ جارج ڈے (Saint George's Day) کو شروع ہوئی تھی اس لیے اسی کی مناسبت سے اس کا نام فورٹ سینٹ جارج رکھا گیا۔ اینڈرو گوگن (Andrew Cogan) کے عہد، ان کی دیکھ ریکھ میں فورٹ سینٹ جارج کی تعمیر ۱۶۴۳ء میں پائے تکمیل کو پہنچی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی شروعات میں صرف تجارتی اغراض کے لیے قائم ہوئی تھی۔ اس وقت کمپنی میں مختلف قسم کے عہدے تھے جیسے منشی، گماشتہ، جونیر مرچینٹ، سینئر مرچینٹ، کونسل، صدر لیکن ان تمام عہدوں میں منشی کے عہدے کو اہمیت وانفرادیت حاصل تھی۔ قانونی طور پر ان منشیوں کا تقرر پانچ سال کے لیے سالانہ دس پونڈ پر ہونے لگا پھر اس مدت کے ختم ہونے پر انہیں تین سال کے لیے سالانہ بیس پونڈ پر دوبارہ مامور کیا جاتا تھا۔ برطانیہ سے نو وارد رائیٹرس (Writer) کو مقامی زبان اور ہندوستانی تہذیب وتمدن سے کوخاص شناسائی نہیں تھی۔ ان کی تعلیم وتربیت کے لیے مدراس کے گورنر مسٹر جوزف کلٹنے (Joseph collett) ۱۷۱۷ء میں فورٹ سینٹ جارج اسکول (رائیٹرس کالج) کی بنیاد ڈالی۔ اس طرح سے منشیوں کی تعلیم وتربیت کے لیے رائیٹرس کالج سب سے پہلا ادارہ بن گیا۔ یہ کالج قلعہ فورٹ سینٹ جارج کے اِحاطہ میں برسوں قائم رہا جو بعد میں فورٹ سینٹ جارج کالج کے نام سے جانا گیا۔

ہندوستان کے سب سے پہلے گورنر جنرل وارین ہیسٹنگ (Warren Hastings) نے ہندوستان کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد ہندوستان کی عوام سے ثقافتی وتمدنی روابط مزید مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ انگلستان سے آنے والے منشیوں کو تیس روپیہ ماہانا بطور الاؤنس دیا جانے لگا تا کہ وہ ذاتی طور پر کسی فارسی کے ماہر استاد سے فارسی زبان سیکھ سکیں۔ ۱۸۱۰ء میں سر جارج بارلو (Sir George Barlow) نے اپنی گورنری کے آخری زمانے میں سینٹ جارج کالج کی جدید تنظیم کے فرائض انجام دیے۔ سر جارج بارلو اپنے ماتحتوں سے اچھا سلوک نہیں کرتے تھے لیکن اپنی ذمے داری کے کو لے کر انتہائی وفادار ملازم تسلیم کیے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی ان تھک کاوشوں سے سینٹ جارج کالج کا معیار بلند کیا۔ ہندوستانی مؤرخ ڈاکٹر بی۔ بی۔ مشرا اپنی کتاب ''دی سینٹرل ایڈمنسٹریشن آف دی ایسٹ انڈیا کمپنی'' میں رقم طراز ہیں:

> ''گورنمنٹ مدراس نے سیول ملازمین کو مقامی تعلم دینے کے لیے ۱۸۰۸ء میں فورٹ سینٹ جارج اسکول کا از سر نو اِحیا کیا۔''

ایک انگریز مؤرخ ایچ۔ڈی۔ لو نے فورٹ سینٹ جارج کالج کے قیام و تنظیم جدید کا سن ۱۸۱۲ء بتایا ہے۔ پروفیسر سری نواس چاری نے اپنی کتاب ''ہسٹری آف دی سٹی آف مدراس'' سینٹ جارج کالج کے قیام کی سنہ ۱۸۱۲ء بتائی ہے۔ بنیادی طور پر اس کالج کے اغراض و مقاصد بھی وہی تھے جو فورٹ ولیم کالج کے تھے یعنی جونیئر سیول ملازمین کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرنا فورٹ سینٹ جارج کالج ۱۷۱۷ء سے ۱۸۱۲ء تک مدراس کے اِحاطے میں کام کرتا رہا۔ ۱۸۱۶ء میں مسٹر گیارو کا مکان دس سال کے پٹہ پر حاصل کیا گیا۔ ۱۸۲۷ء میں کالج کو ایک مالدار تاجر مسٹر موریٹ کے مکان میں منتقل کیا گیا۔ انگریز مؤرّخ ایچ۔ڈی (H.D Love) نے اپنی کتاب ''ویسٹیج آف اوڈ مدراس'' (Vestige Of Old Madras) میں رقم کیا ہے یہ عمارت گورنمنٹ مدراس نے نوّے ہزار روپے کے سرمایہ کے عوض خریدی تھی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱۱﴾ سینٹ جارج ڈے کس تاریخ میں منایا جاتا ہے؟

﴿۱۲﴾ قلعہ فورٹ سینٹ جارج کی تعمیراتی کام کب مکمل ہوا تھا؟

﴿۱۳﴾ کالج میں منشیوں کا تقرر کتنے محنتانہ پر کیا جاتا تھا؟

﴿۱۴﴾ فورٹ سینٹ جارج کالج کی بنیاد کب اور کس نے ڈالی تھی؟

﴿۱۵﴾ اس کالج کا مقصدِ اصلی کیا تھا؟

﴿۱۶﴾ ہندوستان کے سب سے پہلے گورنر کا کیا نام تھا؟

﴿۱۷﴾ انگلستان سے آنے والے منشیوں کو کتنے روپے بطورِ الاؤنس دیا جاتا تھا؟

﴿۱۸﴾ سینٹ جارج کالج کی تنظیمِ جدید کے فرائض کس نے انجام دیے تھے؟

﴿۱۹﴾ دی سینٹرل ایڈمنسٹریشن آف دے ایسٹ انڈیا کمپنی کتاب کے مصنف کا کیا نام تھا؟

11.05 فورٹ سینٹ جارج کے قیام کے اہم مقاصد

اس کالج کے مقاصد بھی وہی تھے جو فورٹ ولیم کالج کے تھے یعنی نو وارِد انگریز ملازمین کی تعلیم و تربیت کا انتظام و انصرام کرنا تھا۔ پھر بھی دونوں میں قدرِ فرق تھا۔ فورٹ ولیم کالج میں صرف منشیوں کی تعلیم کا انتظام تھا لیکن جارج کالج میں منشیوں کے علاوہ وکلا و ججیز کو تعلیم و ٹریننگ بھی دی جاتی تھی۔

جارج کالج کا شعبۂ تعلیم دکنی ہندوستانی اردو، عربی، فارسی، سنسکرت، تیلگو، ملیالم اور تامل زبانوں کے شعبوں کے علاوہ قانون اور ریاضی کے شعبوں پر مشتمل تھا۔ تراب علی نامی اس کالج کے شعبہ عربی، فارسی اور اردو کے صدر تھے۔ حسن علی شعبہ فارسی و ریاضی کے صدر تھے ان افراد کے علاوہ شمس الدین، منشی ابراہیم بیجاپوری، منشی مظفر، محمد مہدی واصف، مرزا عبدالباقی وفا، اسد تاج الدین التاج برسوں اس کالج میں درس و تدریس کی خدمات انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ کالج میں تصنیف و تالیف کا ایک علیحدہ شعبہ تھا جہاں ہندوستانی (اردو) دکنی، عربی، فارسی اور دیگر مقامی زبانوں میں ادبی تصانیف کے ساتھ ساتھ قانون و ریاضی کی متعدد کتابیں کالج کی جانب سے طبع ہوتی رہیں۔ صرف ونحو، لغت، قواعد، داستان، تاریخ، سوانح اور اخلاقیات جیسے موضوعات پر دکنی زبان میں خاص طور پر کتابیں لکھی گئی۔ جارج کالج کا مطبوعات و مخطوطات کی شکل میں موجود سرمایہ دکنی زبان میں دست یاب ہے۔ اس بیش بہا سرمایہ میں درج ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں۔

حکایات الجلیلہ، انوار سہیلی، سنگاسن بتیسی اور گلستاں کو مترجمین نے دکنی قرار دیا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خان نے منشی ابراہیم کی دکنی زبان میں لکھی ''انوار سہیلی'' کو قدیم اردو کا آخری بڑا کارنامہ قرار دیا ہے۔

فورٹ سینٹ جارج کالج کا اپنا ایک پریس بھی تھا یہیں سے اکثر و بیشتر کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس پریس سے سب سے پہلی کتاب ڈاکٹر ہینری ہیرس کی ہندوستانی زبان کا تجزیہ اور اس کی قواعد و لغت ہے جسے ۱۸۰۷ء میں شائع کیا گیا تھا۔ نو وارد منشیوں کے مطالعہ کے لیے سنیٹ جارج میں ایک شاندار کتب خانے (لائبریری) کی سہولت بھی فراہم کی گئی تھی۔ جس میں مختلف موضوعات کی گراں قدر کتابوں کا نایاب ذخیرہ موجود تھا۔ اس میں عربی، فارسی کے علاوہ مقامی زبانوں جیسے تیلگو، کنڑ، مرہٹی، ملیالم، سنسکرت، بنگالی، اڑیا اور ہندی کی کتابیں

موجود تھیں۔ ولیم ٹیلر نے اس کتب خانے کے دو ضخیم کیٹیلاگ تیار کیے تھے جسے مدراس کے فورٹ سینٹ جارج گزٹ پریس سے شائع کیا تھا۔ کیٹیلاگ کی پہلی جلد کل ۶۷۸ر صفحات اور دوسری جلد ۸۶۴صفحات پر مشتمل تھی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۲۰﴾ جارج کالج میں کون کون سے شعبہ جات تھے؟ تحریر کیجیے۔

﴿۲۱﴾ سینٹ جارج کالج کے چند اساتذہ کے نام تحریر کیجیے۔

11.06 فورٹ سینٹ جارج کالج کے اہم مصنّفین

فورٹ سینٹ جارج کالج کے مصنّفین میں تراب علی نامی، سید حسین شاہ حقیقت، حسن علی ماہلی، منشی غلام حسن معاون خاں، مفتی محمد تاج الدین حسین خاں، مرزا عبدالباقی وفا، مہدی واصف، منشی غلام دستگیر، منشی مظفر، منشی محمد ابراہیم بیجاپوری، منشی محمد شمس الدین احمد وغیرہ کے نام سرِ فہرست ہیں۔

﴿۱﴾ تراب علی نامی :

تراب علی نامی کا شمار کا فورٹ سینٹ جارج کے لائق و ماہر اساتذہ میں ہوتا ہے۔ سینٹ جارج کے تمام اساتذہ میں جو مقبولیتِ دوام تراب علی کو حاصل ہوئی کسی دوسرے کے حصہ میں نہیں آئی۔ علامہ فضلِ امام خیرآبادی، تراب علی کے ہم سبق ساتھی تھے۔ تراب علی نامی نے ۱۸۱۳ سے ۱۸۲۶ء تک کالج میں اپنی خدمات پیش کیں۔ آپ کالج میں عربی، فارسی اور اردو شعبہ کے صدر کے عہدے پر فائز ہوئے۔

﴿۲﴾ سید حسین شاہ حقیقت :

حقیقت کی پیدائش ضلع بریلی میں ہوئی محض چودہ برس کی عمر میں لکھنؤ تشریف لائے اور جرأت کے ادبی حلقے کے وابستہ ہوئے۔ آپ کی تقرری میرِ منشی کے عہدہ پر ہوئی۔ ۱۸۳۳ء میں مدراس میں انتقال ہوا۔ سید حسین شاہ حقیقت کا ادبی سرمایہ درج ذیل ہیں:

(۱) جذبِ عشق (۲) تحفۃ العجم (۳) تذکرہ اَحبا (۴) ہفت نسخہ (۵) دیوان

﴿۳﴾ مہدی واصف :

مہدی واصف فورٹ سینٹ جارج کالج کے بے حد مقبول قلم کاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ کو اردو، فارسی، عربی، ترکی، انگریزی، فرنچ کے علاوہ تیلگو، تامل جیسی مقامی زبانوں پر دست رَس حاصل تھی۔ ۱۸۰۲ء میں مدراس میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ مہدی واصف مختلف کتابوں کے مصنف، مترجم اور مرتب تھے۔ ۱۸۱۸ء سے لے کر ۱۸۳۵ء تک مسلسل سترہ برس اپنی علمی و ادبی خدمات پیش کی تھی۔

(۱) انگریزی ہندوستانی اور فارسی لغت۔ اشاعت ۱۸۵۱ء

(۲) دلیل ساطع۔ ہندی، سنسکرت، فارسی لغت۔ اشاعت ۱۸۴۳ء

(۳) مناظر اللغات۔ جو فارسی اردو لغت ہے۔ اشاعت ۱۸۵۱ء

مہدی واصف کے دو شعری دیوان دستیاب ہیں۔ پہلا دیوان مسکین اور دوسرا نعتیہ دیوان روضۂ رضوان کے نام سے موسوم ہے اسی کے ساتھ ایک فارسی دیوان ''دیوانِ واصف'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

﴿۴﴾ ابراہیم بیجاپوری :

فورٹ ولیم کالج سے وابستہ مصنّفین میں منشی محمد ابراہیم جداگانہ حیثیت کے مالک ہیں۔ آپ کی ترجمہ کردہ کتاب ''دکنی انوار سہیلی'' اپنی انفرادی خصوصیات کی مرجع خواص و عام ہے۔ جسے ٹائپ حروف کی شکل میں کالج نے اپنی نجی پریس سے ۱۸۲۴ء میں شائع کیا تھا۔ اسے خصوصی طور پر کالج کے انگریزی افسران وحکمران کے لیے لکھا تھا۔

﴿۵﴾ مفتی محمد تاج الدین خان بہجت :

مفتی محمد تاج الدین کی پیدائش ۱۷۹۹ء میں مدراس میں ہوئی۔ آپ کے والد گرامی سید غیاث الدین احمد خان ایک ماہر خوش نویس تھے۔ سینٹ جارج کے مدرسہ میں مولوی حسن علی ماہلی، مولوی تراب علی نامی اور مولوی عبدالودود عاشق جیسے جید علما سے اکتساب فیض کیا۔ آپ نے درج ذیل کتابیں بطور یادگار چھوڑی ہیں:

تاج القواعد، رسالہ فنِ عروض وقافیہ مسمی بہ مجمع البحرین، شیخ سعدی کی مشہور زمانہ کتاب فارسی گلستاں کا ترجمہ چمنستان کے نام سے کیا۔ مفتی تاج الدین خان کی وفات ۱۸۹۹ء میں ہوئی۔

﴿۶﴾ مرزا عبدالباقی وفا :

فورٹ سینٹ جارج کالج میں آپ کا تقرر بحیثیت مدرس ہوا تھا۔ ۱۸۸۹ء میں شہر بغداد میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ آپ کے والد میرزا شفیع خان بلدہ گلپایگان میں وزیر کے عہدے پر فائز تھے۔ مرزا عبدالباقی ایک قادرالکلام شاعر تھے۔

﴿۶﴾ منشی شمس الدین احمد :

مدراس کے ساحلی علاقے سے تقریباً ڈھائی میل کی مسافت پر واقع سعادت بندر نامی قصبے میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ آپ کے والد گرامی کا اسم گرامی مولوی عبدالرحیم ہے۔ زہے نصیب آپ کے قصبہ سعادت بندر کو صحابی رسول حضرت تمیم انصاری کا مسکنِ دائمی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آپ کا مزار ہر خاص و عام کے لیے مرکزِ عقیدت کا درجہ رکھتا ہے۔ آپ نے عربی، فارسی اور اردو میں عبور حاصل کیا۔ منشی شمس الدین نے نوجوانی میں ہی کالج سے وابستگی اختیار کر لی تھی۔ فنِ ترجمہ نگاری میں آپ نے نمایاں خدامات انجام دیں۔ شیخ احمد بن محمود کی عربی تخلیق الف لیلہ کا ترجمہ حکایات الجلیلہ ترجمہ الف لیلہ کے نام سے کیا۔ آپ کی ترجمہ کردہ کتاب کی پہلی جلد کی اشاعت ۱۸۳۶ء میں ہوئی، اندازِ نگارش انتہائی سلیس، بامحاورہ اور آسان ہے۔ منشی شمس الدین نے فن ترجمہ نگاری کو وہ کمال عروج بخشا کہ اس کتاب پر اصلی تخلیق ہونے کا شبہ ظاہر ہوتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۲۲﴾ کس محقق نے انوارِ سہیلی کو قدیم اردو کا آخری بڑا کارنامہ قرار دیا ہے؟

﴿۲۳﴾ کالج کی پریس سے سب سے پہلے کون سی کتاب چھاپی گئی تھی؟

11.07 خلاصہ

جس طرح فورٹ ولیم کالج کلکتہ نے اردو ادب کی خدمات انجام دینے کا بیڑا اُٹھا رکھا تھا اسی طرح جنوبی ہندوستان میں فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس نے نو واردِ انگریز افسران و حکمران کی تعلیم و تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ مؤرخین و محققین نے فورٹ ولیم کالج کا تواتر سے ذکر کیا ہے جب کہ سینٹ جارج کالج کے متعلق زیادہ معلومات فراہم نہیں کی گئی ہے۔

لندن کی مہارانی الیزہ بیتھ اوّل (Elizabeth I) نے ایک رائل چارٹر (Royal Charte) کے نفاذ کا فرمان جاری کیا۔ اس کے ذریعہ گورنر اور تجارتی کمپنیوں کو مشرقی ممالک میں تجارت کرنے کے اختیارات (Rights) دیے گیے۔ راجہ چندر گیری سے سالانہ پٹہ پر چینا پٹن (موجودہ مدراس) میں حاصل زمین پر ۱۳؍ اپریل ۱۶۴۰ء میں قلعہ بند کوٹھی کی تعمیر کا آغاز ہوتا ہے۔ چوں کہ اسی تاریخ میں سینٹ جارج ڈے کا انعقاد کیا جاتا تھا اسی کی مناسبت سے اس کا نام فورٹ سینٹ جارج ہوا۔ اینڈ رو گوگن (Andrew Cogan) کے عہد میں فورٹ سینٹ جارج کی تعمیر کا کام مکمل ہوا۔

اس کالج کے اغراض و مقاصد وہی تھے جو فورٹ ولیم کالج کے تھے لیکن جارج کالج کو نسبتاً فوقیت حاصل تھی اس میں عربی، فارسی اور اُردو کے ساتھ ساتھ قانون، ریاضی، تیلگو اور تامل زبانوں کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ فورٹ سینٹ جارج کالج کے مصنّفین میں تراب علی نامی، سید حسین شاہ حقیقت، حسن علی ماہلی، مفتی محمد تاج الدین حسین خاں، مرزا عبدالباقی وفاؔ، مہدی واصف، منشی غلام دستگیر، منشی مظفر، منشی محمد ابراہیم بیجاپوری، منشی محمد شمس الدین احمد وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

11.08 فرہنگ

آغاز	: شروعات، ابتدا	سَرپرستی	: دیکھ بھال، پرورش، نگہبانی
اِحاطہ	: محلّہ، بستی، چوطرفہ حد بندی	سرمایہ	: پونجی، دھن دولت، کمائی
اِختیارات	: اِختیار کی جمع حکم چلانے کی اہمیت، قبضہ	سفارَتی	: سِفارت سے منسوب و متعلق
ادبی حلقہ	: ادب کا ذوق رکھنے والے لوگوں کا گروپ	سلیس	: آسان و عام فہم عبارت
از سرِ نو اِحیا	: دوبارہ کسی چیز کو زندہ کرنا، سنوارنا	شُبہہ	: شک، گمان، وہم، اِحتمال
اغراض	: غرض کی جمع بمعنی مقصد	شعبہ جات	: شعبہ کا جمع بمعنی وِبھاگ وڈپارٹ مینٹ
افسران	: قانون، اسکیم کا نفاذ کرنے والا	شناسائی	: جان پہچان، واقفیت
اِکتسابِ فیض	: فیض حاصل کرنا، علم حاصل کرنا	ضخیم	: طویل، بڑا
الاؤنس	: ہر دن کام کرنے کے عوض ملنے والا اعزازیہ	عروج	: بلندی، اونچائی
اَن تھک	: بغیر تھکے، مسلسل، لگاتار	فَراہم	: اکٹھا، جمع، جمع شدہ، حاصل
اِنفرادیت	: ذاتی خصوصیت میں دوسروں سے الگ ہونا، منفرد ہونا	فرائض	: فرض کی جمع بمعنی ذمہ داری
		قدیمی	: پرانا

اِیشیا : دنیا کے سات بِرِّعظیموں میں سے ایک برآعظم

باگ ڈور : ذمہ داری، اختیار

بامحاورہ : جس میں محاورہ کا استعمال کیا گیا ہو

بدھ مَت : بدھ مذہب کا نظریہ

برطانیہ : انگلینڈ

بندوبست : انتظام وانصرام

بَہجَت : فرحت، خوشی وشادمانی

بیش بہا : انمول، قیمتی، عمدہ

پاؤنڈ : کرنسی کا نام ہے

پائے تکمیل : بمعنی کسی کام کو انجام تک پہنچانا

پٹہ : لیز، زمین کا ٹھیکہ

تجزیہ : کسی چیز کو تقسیم کر کے جانچ پڑتال کرنا

تَشَدُّد : مار پیٹ، شِدّت

تشنگی : پیاس، چھاہت، طلب، تمنا

تصانیف : تصنیف کی جمع بمعنی کتاب

تمدُّن : رہنا سہنا، سماجی زندگی

ثقافت : تہذیب، نظامِ اخلاق

جائزہ : جانچ پڑتال

حکمران : بادشاہ، حکومت چلانے والا

خدمات : خدمت کی جمع بمعنی سیوا، فرماں برداری

خِطاب : حکومت کی طرف سے دیا گیا نام واعزاز، کلام، مکالمہ

خِطّہ : جگہ، مقام، چھوٹا علاقہ

خوش اسلوبی : اچھی تحریر، خوش خطی

درخواست : گزارش، عرض

دسترَس : پہونچ اور رسائی

کسر اٹھانا : گھاٹا کھانا

کونسل : کمیٹی، صلاح ومشورہ کرنے کی غرض سے بنائی گئی کمیٹی

گراں قدر : بیش قیمتی

گلستاں : باغ

گماشتہ : ایجنٹ جو گھوم کر باہر کی آمدورفت ولا کام کرتا ہو

گورنر : کسی صوبے کا حاکم

گہوارَہ : جائے پیدائش

لائق : قابل، اہلیت رکھنے والا

مُترجم : ترجمہ کرنے والا

مُتَعَدِّد : بہت سے، زیادہ، کئی سارے

مُرَتّب : کسی کتاب کو ترتیب دینے والا

مرچینٹ : سوداگر، وِیاپاری، جو تجارتی کاموں میں لگا ہو

مُستَرَد کرنا : خارج کرنا، قبول کرنے سے انکاری ہونا

مَشرِق : پورَب

مُقدَّس : قابل احترام، پاکیزہ

مَمالِک : مُلک کی جمع بمعنی دیس

مناسبت : ہم آہنگی، برابر ہونا

منتقل کرنا : ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جانا، شکل تبدیل کرنا

منشی : استاد، مصنف، کلرک

مؤرِخ : تاریخ کا جانکار

میل : ایک میل لگ بھگ ۱۶۰۹ میٹر کا ہوتا

نایاب : بہت کم پایا جانے والا

نِفاذ کرنا : کسی چیز کو لاگو کرنا، عمل میں لانا

ذخیرہ	: خزانہ، سرمایا		نووَارِدْ	: فریشر، نیا نیا آنے والا شخص
رَقَم طراز	: تحریر کرنے والا، لکھنے والا		وِدیا ساگر	: بحرالعلوم، بہت علم والا
روابط	: رابطہ کی جمع بمعنی تعلق، مراسم		ہم سبق	: ہم جماعت، ایک جماعت میں پڑھنے والے
ریاضی	: Mathematics			

11.09 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : قدیم ہندوستان میں کس چینی مسافر کی آمد ہوئی؟

سوال نمبر۲ : سینٹ جارج کالج کی بنیاد کس نے اور کہاں رکھی؟

سوال نمبر۳ : ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے قدم کیسے جمائے؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : فورٹ جارج کالج کے اہم مصنفین کے نام لکھیے

سوال نمبر۲ : منشی شمس الدین احمد کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟ رقم کیجیے

سوال نمبر۳ : فورٹ سینٹ جارج کالج کے تین مصنفین کی دو دو کتابوں کے نام لکھیے

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : قدیم ہندوستان میں کون سی یونیورسٹی علم وادب کا گہوارہ تھی؟

(الف) علی گڑھ یونیورسٹی (ب) بنارس ہندو یونیورسٹی (ج) مولانا آزاد یونیورسٹی (د) نالندہ یونیورسٹی

سوال نمبر۲ : درج ذیل میں سے کون چینی مسافر ہندوستان آیا تھا؟

(الف) البیرونی (ب) ابوالفضل (ج) فاہیان (د) سہراب

سوال نمبر۳ : وِدیا ساگر کس کا خطاب تھا؟

(الف) فاہیان (ب) مدن موہن مالویہ (ج) البیرونی (د) سرسید احمد خان

سوال نمبر۴ : ساحل کا کیا معنی ہوتا ہے؟

(الف) سمندر کا کنارہ (ب) تالاب (ج) میدان (د) نالندہ یونیورسٹی

سوال نمبر۵ : جذب عشق کے مصنف کا کیا نام تھا؟

(الف) سید حسین شاہ (ب) مہدی واصف (ج) ابراہیم بیجاپوری (د) محمد تاج

سوال نمبر۶ : درج ذیل کتب میں مفتی محمد تاج الدین خان کی کتاب نہیں ہے؟

(الف) تاج القواعد (ب) رسالہ فن عروض وقافیہ (ج) چمنستان (د) آب حیات

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (د) نالندہ یونیورسٹی	جواب نمبر۶ : (الف) سمندر کا کنارہ
جواب نمبر۲ : (ج) فاہیان	جواب نمبر۷ : (ب) مہدی واصف
جواب نمبر۳ : (ج) البیرونی	جواب نمبر۸ : (د) آب حیات

11.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ فورٹ سینٹ جارج کالج از محمد افضل الدین اقبال

۲۔ فورٹ ولیم کالج تحریک اور تاریخ از وقار عظیم

۳۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات از ڈاکٹر عبیدہ بیگم

11.11 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ نالندہ اور تکشلا یونیورسٹیوں میں مشرقی و مغربی ایشیا کے طلبا کی تعداد زیادہ تھی۔

﴿۲﴾ فاہیان ملک چین کا باشندہ تھا۔

﴿۳﴾ ہونگ سانگ ایک چینی مسافر تھا جو بدھ مذہب کا پیرو کار تھا۔

﴿۴﴾ البیرونی کو علم تاریخ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

﴿۵﴾ بنارس کے مذہبی پیشواؤں نے البیرونی کو وِدیا ساگر کے خطاب سے نوازہ تھا۔

﴿۶﴾ وِدیا ساگر کا معنی بحر العلوم یعنی علم کا سمندر ہوتا ہے۔

﴿۷﴾ انگلینڈ کی مہارانی الیزہ بیتھ اول نے رائل چارٹر کا کو جاری کیا تھا۔

﴿۸﴾ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد ۱۶۰۰ء عیسوی میں تجارتی مقصد کے تحت ہوئی تھی۔

﴿۹﴾ ہندوستان میں تجارتی فرمان و اجازت حاصل کرنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے مغل بادشاہ جہاں گیر کے دربار میں عرضی پیش کی تھی۔

﴿۱۰﴾ مغل بادشاہ جہاں گیر کے دربار میں دوسری مرتبہ درخواست ٹامس ایڈورتھ کے ذریعہ پیش کی گئی تھی جسے تسلیم کرلیا گیا تھا۔

﴿۱۱﴾ سینٹ جارج ڈے ۲۳ اپریل کو منایا جاتا ہے۔

﴿۱۲﴾ قلعہ فورٹ سینٹ جارج کا تعمیراتی کام ۱۶۴۳ء میں مکمل ہوا۔

﴿۱۳﴾ کالج میں منشیوں کو دس پاؤنڈ بطور محنتانہ دیا جاتا تھا۔

﴿۱۴﴾ فورٹ سینٹ جارج کالج کی بنیاد گورنر مسٹر جوزف نے ۱۷۱۲ء میں ڈالی تھی۔

﴿۱۵﴾ کالج کا مقصدِ اصلی۔نو وارد انگریزی افسران کو ہندوستانی تہذیب وتمدن،تعلیم وتربیت اور مقامی رسم ورواج سے شناسائی کروانا تھا۔

﴿۱۶﴾ ہندوستان کے پہلے گورنر کا نام وارن ہیسٹنگ تھا۔

﴿۱۷﴾ انگلستان سے آنے والے منشیوں کو تیس روپے ماہانا الاؤنس دیا جاتا تھا۔

﴿۱۸﴾ سینٹ جارج کالج کی تنظیم جدید کے فرائض سر جارج بارلؤ نے انجام دیے تھے۔

﴿۱۹﴾ دی سینٹرل ایڈمنسٹریشن آف دے ایسٹ انڈیا کمپنی کتاب کے مصنف کا نام ڈاکٹر بی بی مشرا ہے۔

﴿۲۰﴾ جارج کالج میں عربی،فارسی،اردو،سنسکرت،تیلگو،تامل اور ملیالم زبانوں کے شعبے موجود تھے۔

﴿۲۱﴾ سینٹ جارج میں مولوی شمس الدین،منشی ابراہیم،منشی ظفر،محمد مہدی واصف،مرزا عبدالباقی وفا،تاج الدین التاج جیسے جید لوگوں نے خدمات انجام دیں۔

﴿۲۲﴾ پروفیسر مسعود حسین خاں نے انوار سہیلی کو اردو کا آخری بڑا کارنامہ قرار دیا ہے۔

﴿۲۳﴾ کالج کی پریس سے سب سے پہلے ڈاکٹر ہینری ہیرس کی کتاب چھاپی گئی۔

اکائی 12 بیسویں صدی کے چنداشاعتی ادارے

ساخت

12.01 : اغراض ومقاصد

12.02 : تمہید

12.03 : انجمن ترقی اردو ۱۹۰۳ء

12.04 : دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۱۳ء

12.05 : دارالترجمہ عثمانیہ ۱۹۱۷ء

12.06 : جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ۱۹۱۹ء

12.07 : جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی ۱۹۲۳ء

12.08 : ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد ۱۹۳۱ء

12.09 : جامعہ اردو علی گڑھ ۱۹۳۹ء

12.10 : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۱۹۹۴ء

12.11 : مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ۱۹۹۸ء

12.12 : خلاصہ

12.13 : فرہنگ

12.14 : نمونہ امتحانی سوالات

12.15 : حوالہ جاتی کتب

12.16 : اپنے مطالعے کے جانچ کے جوابات

12.01 اغراض ومقاصد

اُردو زبان وادب کی ترویج واشاعت میں انفرادی کاوشوں کے ساتھ ہی اجتماعی کوششوں کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ یہ اجتماعی کوششیں ان اِداروں کی صورت میں سامنے آئی ہیں جو انیسویں صدی کے آغاز سے لے کر بیسویں صدی تک ملک کے مختلف حصوں میں قائم کیے گئے۔ زیرِ نظر اکائی میں یہاں اردو کے صرف بیسویں صدی کے چند اشاعتی اداروں کے قیام اور ان کے ذریعہ انجام دیے گئے کارہائے نمایاں پر روشنی ڈالی جائے گی تاکہ آپ اس بات سے واقف ہوسکیں کہ اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے ان اداروں نے کیا کردار ادا کیا۔ یہ ادارے تحقیقی بھی تھے اور تصنیفی وتالیفی بھی۔ کسی ادارے کے قیام کا مقصد درس وتدریس تھا تو کوئی ادارہ اردو کے ناپید ہوتے شعری وادبی سرمائے کی

بازیافت اور آئندہ کے لیے اس کے تحفظ کی خاطر قائم کیا گیا۔ ان میں سے کچھ ادارے اپنا کردار ادا کر کے یا امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں بند ہو گئے اور کچھ آج بھی کام کر رہے ہیں۔ بہرحال اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت اور اس کی موجودہ صورتِ حال کا اندازہ ان اداروں سے واقفیت کی بنا پر کیا جا سکتا ہے۔

12.02 تمہید

زبانوں کا ارتقا فطری طور پر ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حکومتِ وقت کی سرپرستی اس زبان کے ارتقا اور اس کی ترویج واشاعت کی رفتار کو مزید تیز کر دیتی ہے۔ ہندوستان میں فارسی اور انگریزی زبانیں اس کی مثال قرار دی جا سکتی ہیں۔ ان زبانوں کا تعلق دوسرے ممالک سے تھا اور ہندوستان میں کی کوئی بنیاد نہیں تھی لیکن فارسی کو مغلوں اور انگریزی کو انگریزوں نے سرکاری زبان بنا کر اپنے اپنے دَور میں اس ملک کے پڑھے لکھے طبقے کی زبان بنا دیا تھا۔ اردو کی ابتدائی نشوونما کا زمانہ بدقسمتی سے ایسی کسی بھی سہولت سے محروم رہا۔ جس وقت یہ زبان اپنی بنیادوں کو مضبوط کر رہی تھی اس وقت فارسی نے اپنے تہذیبی ولسانی پس منظر سے اس کو متاثر کرنا شروع کیا لیکن یہی وہ وقت تھا کہ جب فارسی کو سرکاری سرپرستی بخشنے والی مغل حکومت کا زوال آخری مراحل سے گزر رہا تھا۔ انگریز ہندوستان کے بڑے حصے پر قابض ہو چکے تھے اور اس نئے حکمراں طبقے کا ایک بڑا حصہ یہ رائے رکھتا تھا کہ ہندوستان میں اب جس زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہو وہ انگریزی زبان ہو۔ ظاہر بات ہے کہ یہ صورتِ حال اردو جیسی نوزائدہ زبان کے تعلق سے بہت مناسب نہ تھی لیکن پھر بھی چوں کہ سماجی ومعاشرتی صورت حال ایسی بن چکی تھی کہ جس میں ایک مخلوط زبان کے ارتقا کو روکا نہیں جا سکتا تھا اس لیے اردو اپنی جڑیں برابر مضبوط کرتی رہی۔ فی الوقت اس اکائی میں بیسویں صدی کے چند اشاعتی اداروں پر گفتگو کی جائے گی۔

12.03 انجمن ترقی اردو ۱۹۰۳ء

اُردو کی ترقی اور اس کے ادب کی اشاعت کے لیے کی جانے والی انفرادی کوششوں میں شاید سب سے اہم مقام بابائے اردو مولوی عبدالحق کی کاوشوں کا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنی پوری زندگی اردو کے فروغ کے لیے وقف کر دی تھی۔ ان کے دوسرے کارناموں سے قطعِ نظر انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں لانا ہی ایک ایسا کارنامہ ہے کہ جس کے باعث وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ انجمن ترقی اردو کا شمار آج برِّصغیر کے اہم ترین اردو اداروں میں ہوتا ہے۔ یہ انجمن پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک حصہ تھی۔ مولوی عبدالحق نے اسے یونیورسٹی سے الگ کر کے ایک مکمل ادارے کی حیثیت سے حیدرآباد اور پھر اورنگ آباد میں قائم کیا۔ اس انجمن کا اہم مقصد اردو کے کلاسیکل ادبیات کو نئے سرے سے منظر عام پر لانا تھا۔ ۱۹۰۳ء میں اپنے قیام سے آج تک ہندو پاک دونوں ملکوں میں انجمن ترقی اردو، اردو کی ترویج واشاعت میں مصروف ہے۔ کتنے ہی کمیاب ادبی جواہر پاروں کو اس انجمن نے شائع کیا۔ تقسیمِ ہند سے قبل ریاستِ حیدرآباد سے سرکاری تعاون اسے حاصل تھا اور مولوی عبدالحق نے اپنے قیامِ حیدرآباد واورنگ آباد کے درمیان نادر ونایاب نثری وشعری تصانیف کو اپنے عالمانہ مقدموں کے ساتھ شائع کیا۔ ان کتابوں میں ملا وجہی کی تصنیف کردہ داستان ''سب رَس'' اور ان کی مثنوی ''قطب مشتری'' بھی شامل ہے۔

مولوی عبدالحق کا سب سے اہم کارنامہ انگریزی، اردو لغت وتدوین ہے انجمن نے ہی اس لغت کو شائع کیا تھا، انجمن کا مطبع اورنگ آباد میں تھا لیکن پورے ہندوستان میں اس کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند کے بعد ہونے والے فسادات میں

بلوائیوں نے دہلی میں انجمن کا دفتر جلا دیا جس سے کئی اہم مخطوطات اور بہت سا تصنیفی و تالیفی سرمایہ جل کر خاک ہوگیا۔ یہ انجمن آج بھی برقرار ہے اور کام بھی کررہی ہے۔ کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ہی اردو کے فروغ کے لیے دوسرے طریق کار بھی اس نے اختیار کیے ہیں۔ ''اردو ادب'' کے نام سے اس کا ایک سہ ماہی جریدہ بھی شائع ہوتا ہے۔

انجمن نے جو کتابیں شائع کیں ان میں قدیم تذکروں کے مخطوطات بڑی تعداد میں شامل ہیں: مثلاً نکات الشعراء، عقدِ ثریّا وغیرہ۔ مولوی عبدالحق نے تحقیق پر بھی بے حد زور دیا اور معراج العاشقین، نصرتی، سب رس جیسی کتابیں تحقیقی کاوشوں کی بنا پر شائع ہوسکیں۔ ان کتابوں کے علاوہ نصابی کتب بھی انجمن نے شائع کیں۔ مولوی عبدالحق نے تنقیدی و تحقیقی کتابوں پر جو مقدمے لکھے وہ بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور ان سے اردو شاعری و نثر نگاری کی اہم خصوصیات سے بھی واقفیت حاصل ہوئی ہے۔ ادبی کتابوں کے علاوہ فنون کی ترقی کے لیے اصطلاحات پیشہ وراں انجمن نے شائع کی۔ انجمن سے شائع ایک اور اہم کتاب وحیدالدین سلیم کی تصنیف ''وضعِ اصطلاحات'' ہے۔ اس طرح اردو کتب کی اشاعت میں انجمن کا کردار اہم ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ سر اکبر حیدری نے کس کی تحریک پر اردو یونیورسٹی کے تعلق سے عرض داشت پیش کی؟

﴿۲﴾ جامعہ عثمانیہ کا قیام کب عمل میں آیا؟

﴿۳﴾ انجمن ترقی اردو کب قائم ہوئی؟

﴿۴﴾ انجمن ترقی اردو پہلے کس یونیورسٹی سے وابستہ تھی؟

12.04 دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۱۳ء

اُردو کے مایہ ناز ادیب، شاعر اور مؤرّخ علامہ شبلی نعمانی نے اسلامیات اور دینی علوم کے تعلق سے تحقیق و تصنیف اور ترتیب و تالیف کے کام کو آگے بڑھانے اور اسے معیار عطا کرنے کی غرض سے ۱۹۱۳ء میں شہر اعظم گڑھ یوپی میں دارالمصنّفین کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ لیکن اس ادارے نے خود کو محض اسلامی علوم و افکار تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ افسانوی اور غیر افسانوی ادب کے ساتھ ہی تحقیق پر بھی خاطر خواہ توجہ دی۔ دارالمصنّفین سے شائع کتب کو ہم تین زمروں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

﴿۱﴾ تحقیقی کتب

﴿۲﴾ تاریخِ اسلام اور تاریخِ ہند پر کتابیں

﴿۳﴾ عام کتب

تاریخِ اسلام اور تاریخِ ہند پر اس ادارے نے اچھی خاصی تعداد میں کتابیں شائع کیں۔ علامہ عبدالسلام ندوی اور جناب صباح الدین عبدالرحمٰن نے بے انتہا تحقیق و جستجو سے کام لے کر اسلام اور ہندوستان کی تاریخ پر کتابیں لکھیں۔ مسلم دَورِ حکومت میں فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر نیز طرزِ معاشرت پر بے حد معیاری کتابیں شائع ہوئیں۔ ''بزمِ تیموریہ'' جیسی اہم کتاب صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھی۔ اس

ادارے سے ایک اہم تحقیقی مجلّہ ''المعارف'' کے نام سے اس کے قیام کے ابتدائی دنوں سے نکلنا شروع ہوا اور آج بھی یہ رسالہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ ایک اور اہم پیش رفت اس ادارے نے یہ کی کہ مغربی علوم و فلسفے کی کتابوں کو بھی ترجمہ کر کے شائع کیا۔ ادارے کے لیے ترجمے کا یہ کام کر رہا ہے اور اردو کے تصنیفی و تالیفی اداروں میں اس کا اہم مقام ہے۔

12.05 دارالترجمہ عثمانیہ ۱۹۱۷ء

اب ایک ایسے ادارہ کا ذکر جو بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں خالصاً اردو زبان کو ترقی دینے کی غرض سے قائم کیا گیا۔ یہ ادارہ بھی ایک حکومت یعنی ریاستِ حیدرآباد کی سرکاری زبان اور قرار دی گئی اس لیے جب اردو زبان کی ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی بات سامنے آئی تو اس وقت سب سے اہم مسئلہ اردو میں مختلف علوم کی کتابوں کی فراہمی کا تھا۔ اسی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے دارالترجمہ عثمانیہ کا قیام جامعہ عثمانیہ کے قیام یعنی ۱۹۱۹ء سے دو سال قبل ۱۹۱۷ء عمل میں آیا۔ اس دارالترجمے میں ترجمے کے کام کو انجام اور اس کی نگرانی کے لیے چند کمیٹیاں قائم کی گئیں جو ذیل میں درج ہیں۔

﴿۱﴾ **مجلس وضع اصطلاحات :**

اس کمیٹی کا کام انگریزی اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کرنا تھا یعنی اردو میں اصطلاحات وضع کرنی تھیں۔

﴿۲﴾ **مجلس اہل علم و فن :**

یہ مجلس مختلف علوم کے ماہرین پر مشتمل تھی جن سے اصطلاحات وضع کرنے کے سلسلے میں مشورہ لیا جاتا تھا۔

﴿۳﴾ **مجلس انتخابات نصابات :**

درس و تدریس کے لیے نصاب کی تیاری اور کتابوں کے انتخاب کی ذمہ داری اس کمیٹی کی تھی۔

﴿۴﴾ **مجلس نظر ثانی :**

کتابوں کے تراجم اور وضع کردہ اصطلاحات پر یہ کمیٹی نظرِ ثانی کرتی تھی۔

﴿۵﴾ **مذہبی نقطۂ نظر سے ترجموں کو دیکھنے والی کمیٹی۔**

﴿۶﴾ ادبی نقطۂ نظر سے ترجموں کو دیکھنے والی کمیٹی۔

دارالترجمہ کے ارکان میں اردو کے اس دَور کے مشاہیرین کی بڑی تعداد شامل تھی۔ ان حضرات میں بابائے اردو مولوی عبدالحق، چودھری برکت علی، مولوی عبدالحلیم شرر، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولوی وحید الدین سلیم، مولانا سید سلیمان ندوی، جوش ملیح آبادی وغیرہ شامل تھے۔ ڈاکٹر مجیب الاسلام مصنّف دارالترجمہ کی علمی و ادبی خدمات کے مطابق اس ادارے میں ۴۵۷ کتابیں ترجمہ و تالیف کی گئیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۵﴾ دارالترجمہ عثمانیہ کب اور کہاں قائم ہوا؟

﴿۶﴾ مجلس وضع اصطلاحات کا کیا کام تھا؟

12.06 جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ۱۹۱۹ء

ریاستِ حیدرآباد دکن میں ایک اعلیٰ درجے کی یونیورسٹی جہاں ذریعۂ تعلیم اردو ہو، کا خواب بہت دنوں سے دیکھا جا رہا تھا۔ ۱۸۸۵ء میں سرسالار جنگ ثانی نے ''نظام یونیورسٹی'' کا منصوبہ پیش کیا تھا لیکن اس وقت یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ ۱۹۱۸ء میں سلطنتِ آصفیہ کے آخری حکمراں میر عثمان علی خان کے عہد میں پھر ایک بار بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تحریک پر سر اکبر حیدری نے ایک اردو یونیورسٹی کے تعلق سے نظام کے حضور عرض داشت پیش کی۔ اس مرتبہ نتیجہ خاطر خواہ رہا اور میر عثمان علی خاں نے جو خود اردو کی ترویج و اشاعت سے گہری دل چسپی رکھتے تھے، اس یونیورسٹی کے قیام کی اجازت دے دی۔ یہ طے پایا کہ اس یونیورسٹی کا نام عثمانیہ یونیورسٹی ہوگا۔

۲۸/ اگست ۱۹۱۹ء کو اس جامعہ کا قیام عمل میں آیا جو ۱۹۴۸ء تک اردو میڈیم یونیورسٹی کی حیثیت سے کام کرتی رہی۔ یہ دنیا کی پہلی یونیورسٹی تھی جہاں ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔ انٹرمیڈیٹ، گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن تک کی تعلیم کے لیے میڈیم اردو زبان تھی۔ ایک قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ میڈیسن کی پڑھائی بھی اردو میں ہوتی تھی۔ جامعاتی سطح پر اردو ذریعۂ تعلیم نے اردو زبان کو بے حد فائدہ پہنچایا۔ کثیر تعداد میں مختلف علوم سے متعلق کتابیں اردو میں ترجمہ ہوئیں۔ اس جامعہ کے دارالترجمہ نے ہزاروں نئی اصطلاحیں تیار کیں جن کی وجہ سے ترجمے کا عمل میں آسان ہوگیا۔ زبان میں یہ صلاحیت پیدا ہوئی کہ ادب کے علاوہ مختلف علوم کا لٹریچر تیار کیا جا سکے۔ ۱۹۴۸ء میں پولیس ایکشن کے بعد جامعہ عثمانیہ سے اردو ذریعۂ تعلیم ختم کر دیا گیا لیکن چالیس سال سے کم عرصے تک کام کرنے والی اس یونیورسٹی نے اس بات کو ثابت کر دیا کہ اُردو زبان جدید علوم و فنون کی تدریس کا فریضہ اسی طرح انجام دے سکتی ہے کہ جس طرح انگریزی یا دیگر ترقی یافتہ زبانیں۔

12.07 جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی ۱۹۲۳ء

جامعہ اسلامیہ ۱۹۲۳ء میں اس وقت قائم ہوئی جب ملک میں تحریک عدم تعاون زوروں پر تھی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ان طلبا اور اساتذہ نے اس کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔ جنھوں نے اس تحریک کے تحت مسلم یونیورسٹی سے کنارہ کشی اختیار کی۔ ابتدا میں یہ علی گڑھ میں ہی قائم کی گئی پھر اسے دہلی منتقل کر دیا گیا۔ مولانا محمد علی جوہر اور حکیم اجمل خان نے اس جامعہ کی ترقی اور بقا کے تعلق سے جن نکات پر زور دیا تھا ان میں سے اہم بات یہ تھی کہ تعلیم اردو زبان کے ذریعہ دی جائے۔ یہاں بہت دنوں تک اردو ہی مکمل طور پر ذریعۂ تعلیم رہی ہاں طالب علموں کو انگریزی میں بھی تعلیم حاصل کرنے کی سہولت حاصل تھی۔

آزادی کے بعد ہندوستانی حکومت نے اس جامعہ کو خود مختار یونیورسٹی کا درجہ عطا کیا اور ساتھ ہی اس کے مالی مصارف یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ذمہ دار کر دیئے گئے۔ اس یونیورسٹی کا معیار تعلیم آج بھی بے حد اچھا ہے اور اس کے شعبۂ سیاسیات، شعبۂ اسلامیات، شعبۂ اُردو اور شعبۂ فارسی کو ان کے معیار تعلیم کی وجہ سے بیرون ملک کو بھی جانا جاتا ہے۔ جامعہ ملیہ کا اپنا مطبع بھی ہے جو مکتبۂ جامعہ کے نام سے مشہور ہے یہ مکتبہ نہ صرف جامعہ کی تنقیدی و تحقیقی کتابوں کو شائع کرتا ہے بلکہ دوسرے مصنّفین کی کتابیں بھی یہاں سے شائع ہوتی رہی ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کی تقریباً سبھی کتابیں مکتبہ جامعہ سے ہی شائع ہوئی ہیں۔ گو کہ اب اس یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہو گیا ہے لیکن اردو میں امتحان دینے کی سہولت آج بھی برقرار ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۷﴾ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام کس سنہ میں عمل میں آیا؟

﴿۸﴾ آزادی کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کو حکومتِ ہند نے کس کا درجہ عطا کیا؟

12.08 ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد ۱۹۳۱ء

مشہور ماہر لسانیات اور محقق ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ۱۹۳۱ء اردو کے اس ادارے کو قائم کیا تھا۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ ایک منفرد ادارہ ہے۔ اس کا ایک وسیع کتب خانہ ہے۔ جس میں اردو زبان وادب سے متعلق ہزاروں کتابیں اور مخطوطات موجود ہیں۔ اس مخطوطات کی تعداد کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف ان کی فہرست پانچ جلدوں میں شائع ہوئی ہے ادارۂ ادبیات اردو سے منسلک ایک شاندار میوزیم بھی ہے جو سلاطینِ دکن سے وابستہ نوادرات کا اچھا ذخیرہ رکھتا ہے۔ اردو کے ترویج واشاعت اور اس کے ادب کی ترقی اس ادارے کا بھی نصب العین رہا ہے۔ اسی بنا پر ادارۂ ادبیات اردو نے اردو کے امتحانات کا سلسلہ شروع کیا جو آج بھی جاری ہے۔ بہر حال ملک کے مختلف حصوں سے شائع ہونے والی اردو کی اہم کتابیں اس ادارے کے بکڈ پو میں موجود رہتی ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو کا مکمل انتظام ایک واضح دستور اور اصول وقوانین کے تحت کیا جاتا ہے۔ ادارہ برسوں سے ''سب رَس'' کے نام سے ایک علمی وادبی جریدہ شائع کرتا آرہا ہے۔ یہ ایک معیاری جریدہ ہے اور زبان وادب کے حوالے سے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۹﴾ جامعہ اردو کے تحت منعقد کیے جانے والے امتحانات کون سے ہیں؟

﴿۱۰﴾ ادارۂ ادبیات اردو کس نے قائم کیا تھا؟

12.09 جامعہ اردو علی گڑھ ۱۹۳۹ء

''جامعہ اردو علی گڑھ'' یہ شہرِ علی گڑھ میں واقع ہے۔ اس کا قیام ۱۹۳۹ء میں عمل آیا۔ اسے یہ اعزار حاصل ہے کہ ملک میں فاصلاتی طرزِ تعلیم کو پہلی مرتبہ اسی ادارہ نے فروغ دیا ہے۔ یہ ادارہ ان معنوں میں ایک خودمختار ادارہ ہے کہ اس کا اپنا تعلیمی نصاب اور امتحان کا شعبہ بھی اس کا اپنا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے چانسلر اور وائس چانسلر بھی الگ ہوتے ہیں۔ ادیب اور ادیب کامل کے علاوہ دوسرے کئی امتحانات جامعہ اُردو کے ذریعہ منعقد کیے جاتے ہیں۔ گو کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم اور اس کے مضامین شامل نصاب نہیں ہیں لیکن ثقافت، ادب، تہذیب اور تمدّن کے تعلق سے جامعہ اردو کا نصاب بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اس ادارے کے ملک بھر میں کئی مراکز ہیں جو طالب علموں کو جامعہ کی نصابی کتب فراہم کرتے ہیں۔

12.10 قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۱۹۹۴ء

وزارت برائے فروغِ انسانی وسائل حکومت ہند کے ادارے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بھی اردو کی ترویج واشاعت میں اہم کردار ہے۔ دراصل یہ قومی کونسل ترقی اردو بیورو کی نئی اور ترقی یافتہ شکل ہے۔ اردو بیورو کا قیام آزادیِ ہند کے بعد عمل میں لایا گیا۔ اس ادارے کا مقصد تحقیقی کتابوں کی اشاعت، انگریزی سے مختلف علوم وفنون کی کتب کا اردو میں ترجمہ اور اشاعت نیز بچوں کے لیے کتابوں کی

اشاعت تھا۔ ۱۹۹۶ء میں بیورو کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا نام دیا گیا۔ اردو کے فروغ کے لیے بنائی جانے والی سرکاری پالیسیوں کا نفاذ کرنا، مختلف علوم وفنون کی اردو میں کتابوں کی فراہمی۔ اردو کی نایاب وکمیاب کلاسیکی نوعیت کی کتابوں کی پھر سے اشاعت وغیرہ۔ اس کونسل میں کے فرائض میں شامل ہے۔

اردو میں تکنیکی مواد بھی فراہم کرنا اس ادارے کی ذمہ داری ہے۔ کچھ وقت پہلے ایک بہت بڑا کام اردو کونسل نے اردو کی انسائیکلو پیڈیا تیار کر کے انجام دیا ہے۔ یہ کونسل فکر وتحقیق کے نام سے ایک سہ ماہی تخلیقی مجلّہ اور اردو دنیا کے نام سے ایک ماہنامہ بھی شائع کرتی ہے۔ یہ دونوں رسالے اردو کے معیاری رسائل میں شمار ہوتے ہیں۔ ارو کے کم وبیش سبھی تصنیفی وتالیفی نیز اشاعتی اداروں نے بچوں کے ادب کو نظر انداز کیا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اس جانب بھی خاطر خواہ توجہ دی ہے۔ چلڈرن بک ٹرسٹ کی کتابوں کے اردو تراجم رنگین اور دیدہ زیب تصاویر کے ساتھ شائع کر کے کونسل نے بچوں کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ بچے ان کتابوں سے بہ آسانی اردو سیکھ سکتے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱۱﴾ دارالمصنّفین کب اور کہاں قائم ہوا؟

﴿۱۲﴾ بزمِ تیموریہ کا مصنف کون ہے؟

﴿۱۳﴾ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کس ادارے کی نئی شکل ہے؟

﴿۱۴﴾ قومی کونسل حکومت کی کس وزارت کے تحت کام کرتی ہے؟

12.11 مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ۱۹۹۸ء

عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے اردو ذریعۂ تعلیم ختم ہونے کے بعد یہ ضرورت بڑی شدّت سے محسوس کی جا رہی تھی کہ ملک میں ایک ایسی یونیورسٹی پھر قائم ہو جس میں تمام علوم کی تعلیم اردو زبان میں دی جا سکے۔ اس سلسلے میں محبّانِ اردو کی جانب سے مختلف اوقات میں بارہا مرکزی حکومت سے رجوع کیا گیا بہر حال یہ کوششیں رنگ لائیں اور حکومت نے پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے تحت ۱۹۹۸ء میں ایک مرکزی یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا جہاں ذریعۂ تعلیم اردو ہو اور روایتی وفاصلاتی دونوں طریقۂ تعلیم کو بروئے کار لایا جائے۔

یونیورسٹی کا نام مشہور ترین علمی وادبی، مذہبی وسیاسی، دانشور شخصیت اور ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے نام پر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی رکھا گیا۔ اس یونیورسٹی کے قیام کے لیے شہر حیدرآباد کا انتخاب کیا گیا۔ یہیں اس کا ایک خوب صورت کیمپس ہے جس میں مختلف شعبوں اور دفاتر کے لیے عالی شان عمارتیں تعمیر کی جا چکی ہیں۔ گزشتہ چند سال کے عرصے میں اس یونیورسٹی نے بے حد ترقی کی ہے۔ گریجویشن کی سطح پر مختلف ڈگری کورسس متعارف کرائے گئے ہیں، پوسٹ گریجویشن کی سطح پر بھی اسی طرح مختلف مضامین کی تعلیم کا انتظام ہے۔ یہ سبھی کورسز روایتی وفاصلاتی دونوں طریقۂ تعلیم کے ذریعہ پڑھائے جاتے ہیں۔

پورے ملک میں اور بیرونِ ملک بھی کئی شہروں میں اس یونیورسٹی کے مراکز قائم کیے جا چکے ہیں۔ طلبا وطالبات کی بڑی تعداد اردو ذریعۂ تعلیم سے تعلیم حاصل کرتی ہے۔ چوں کہ اردو زبان میں نصابی کتب کی فراہمی سب سے بڑا مسئلہ تھا اس لیے یونیورسٹی میں ایک ٹرانسلیشن ڈویژن بھی قائم کیا گیا۔ یہ ڈویژن اب ڈپارٹمنٹ میں تبدیل ہو چکا ہے اور پوسٹ گریجویشن کی سطح پر ایم۔اے ان ٹرانسلیشن کا دو

سالہ کورس چل رہا ہے۔ٹرانسلیشن ڈویژن نے مختلف تعلیمی نصابات کے لیے کتابوں کا ترجمہ بھی کروایا اور کتابیں تصنیف بھی کروائیں۔موجودہ وقت میں اس یونیورسٹی سے پی.ایچ.ڈی اور ایم فل وغیرہ کورسز بحسن خوبی چل رہے ہیں۔اس طرح مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اردو ذریعۂ تعلیم سے تعلیم فراہم کرنے کا موجودہ دَور میں سب سے بڑا ادارہ ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱۵﴾ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام کب عمل میں آیا؟

﴿۱۶﴾ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم کیا ہے؟

12.12 خلاصہ

اُردو زبان وادب کی ترویج واشاعت میں انفرادی کوششوں کے ساتھ ساتھ اجتماعی کاوشوں کا بھی اہم کردار رہا ہے۔یہ اجتماعی کوششیں ان اداروں کی صورت میں سامنے آئی ہیں جو انیسویں صدی عیسوی کے بالکل آغاز سے لے کر بیسویں صدی کے آخر تک ملک کے مختلف حصوں میں قائم کیے گئے لیکن یہاں صرف بیسویں صدی میں قائم کیے گئے اداروں پر بات کی گئی ہے۔

اُردو کا ایک اہم ادارہ انجمن ترقی اردو ۱۹۰۳ء ہے۔جس کا قیام بابائے اردو مولوی عبدالحق کی کوششوں سے عمل میں آیا۔اس انجمن کا مقصد ناپید ہوتے اردو کے لسانی اور ادبی وشعری سرمائے کو دوبارہ منظر عام پر لانا۔یہ انجمن حیدرآباد میں قائم کی گئی۔تقسیم کے بعد اس کی ایک شاخ پاکستان میں بھی قائم ہوئی۔اس انجمن سے اہم علمی وادبی کتابیں شائع ہوئیں جن میں ''سب رَس'' بھی شامل ہے۔اس کے علاوہ مولوی عبدالحق نے انگریزی اور اردو کے ایک گراں قدر لغت تیار کی جس کو اسی انجمن نے شائع کیا۔

علامہ شبلی نعمانی نے ۱۹۱۳ء میں اسلامی علوم اور تاریخ پر اہم کتابوں کی تیاری اور ان کی اشاعت کے لیے اپنے وطن اعظم گڑھ میں دارالمصنّفین نام کا ادارہ قائم کیا۔اس ادارے نے بھی بے حد اہم کتابیں شائع کیں۔اس ادارے سے ایک رسالہ ''المعارف'' کے نام سے آج تک شائع ہورہا ہے۔دارالترجمہ عثمانیہ کا قیام ۱۹۱۷ء عمل میں آیا۔کتابوں کے ترجمے کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس دارالترجمے نے ترجمے کے کام کو بحسن خوبی انجام دیا۔

اردو تعلیم کو فروغ دینے کے لیے جو ادارہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل رہا ہے وہ حیدرآباد میں نظام حیدرآباد، میر عثمان علی خاں کی قائم کردہ عثمانیہ یونیورسٹی۔یہ یونیورسٹی ۱۹۱۹ء میں قائم کی گئی اور اس میں ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔اردو میں نصابی کتب کی فراہمی ایک مسئلہ تھی اس لیے یونیورسٹی کے قیام سے دو سال قبل ایک دارالترجمہ قائم کیا گیا جس نے مختلف علوم وفنون کے کتابیں کثیر تعداد میں اردو میں ترجمہ کرا کر شائع کیں۔جامعہ اسلامیہ ۱۹۲۳ء میں اس وقت قائم ہوئی۔ابتدا میں یہ علی گڑھ میں ہی قائم کی گئی پھر اسے دہلی منتقل کردیا گیا۔مولانا محمد علی جوہر اور حکیم اجمل خان نے اس جامعہ کی ترقی اور بقا کے تعلق سے جن نکات پر زور دیا تھا ان میں سے اہم بات یہ تھی کہ تعلیم اردو زبان کے ذریعہ دی جائے۔آزادی کے بعد ہندوستانی حکومت نے اس جامعہ کو خودمختار یونیورسٹی کا درجہ عطا کیا۔مشرقی علوم کے شعبے اس یونیورسٹی کی اہم پہچان ہیں۔بطور خاص شعبۂ سیاسیات اور اسلامیات اپنے معیاری تعلیم کے لیے بیرونِ ملک بھی جانے جاتے ہیں۔اس یونیورسٹی کا اپنا مطبع بھی ہے جو مکتبۂ جامعہ کے نام سے مشہور ہے۔

۱۹۳۱ء میں مشہور ماہر لسانیات اور محقق ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ادارۂ ادبیات اردو نامی عظیم ادارے کو قائم کیا تھا۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ ایک منفرد ادارہ ہے۔ اس کا ایک وسیع کتب خانہ ہے۔ جس میں اردو زبان وادب سے متعلق ہزاروں کتابیں اور مخطوطات موجود ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو کا مکمل انتظام ایک واضح دستور اور اصول وقوانین کے تحت کام کرتا ہے۔

''جامعہ اردو علی گڑھ'' کا قیام ۱۹۳۹ء میں عمل آیا یہ ادارہ علی گڑھ میں واقع ہے۔ ملک میں فاصلاتی طرزِ تعلیم کو پہلی مرتبہ اسی ادارہ نے فروغ دیا ہے۔ یہ ادارہ ایک خودمختار ادارہ ہے کہ اس کا اپنا تعلیمی نصاب اور امتحان کا شعبہ بھی اس کا اپنا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے چانسلر اور وائس چانسلر بھی الگ ہوتے ہیں۔ ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل اور معلم اردو کے علاوہ دوسرے کئی امتحانات جامعہ اردو کے ذریعہ منعقد کیے جاتے ہیں۔

آزادی کے بعد حکومتِ ہند نے اردو زبان کی ترقی کے لیے ''ترقی اردو بیورو'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ ۱۹۹۶ء میں اس ادارے کا نام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کر دیا گیا جو وزارت انسانی وسائل حکومت ہند کے تحت آتا ہے۔ قومی کونسل کا اہم کام اردو کے تعلق سے مرکزی حکومت کی پالیسیوں کو نافذ کرنا ہے۔ یہ ادارہ بھی مختلف علوم وفنون پر اہم کتابیں شائع کرتا ہے۔

جامعہ عثمانیہ سے اردو ذریعۂ تعلیم کے خاتمے کے بعد یہ ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جو اردو زبان میں تعلیم فراہم کرے۔ اس ضرورت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ۱۹۹۸ء پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت اردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اردو میں کتابیں نصابی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی تھیں اس لیے ترجمہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت بن گیا۔ یونیورسٹی میں ان کتابوں کی تراجم کے لیے ٹرانسلیشن ڈویژن قائم کیا گیا جو اَب شعبۂ ترجمہ ہوگیا ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی روایتی اور فاصلاتی دونوں طریقہ ہائے تعلیم کے ذریعہ اردو زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی مواقف فراہم کرتی ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ بیسویں صدی کے مذکورہ تمام ادارے اپنے کردار ومعیار میں انتہائی اہم مقام کے حامل ہیں۔

12.13 فرہنگ

اجتماعی	: اجتماع کی طرف منسوب	فروغ	: ترقی، عروج
اشاعتی	: اشاعت کرانے والے	کنارہ کشی	: علیحدگی، بے تعلقی، دُوری
امتدادِ زمانہ	: زیادہ عرصہ گزر جانا	گراں قدر	: عمدہ، نفیس، جس کی قدر وقیمت زیادہ ہو
بازیافت	: کسی شے کے حاصل کرنے یا ہونے کا عمل، دوبارہ کھوج	لسانی	: زبان سے متعلق
		مخطوط	: ہاتھ کا لکھا ہوا
بلوائیوں	: بلوائی کی جمع، دنگا فساد کرنے والا	مخطوطات	: مخطوطہ کی جمع، قلمی تحریریں غیر مطبوعہ کتابیں یا رسالہ
پیش رفت	: کارگر، نتیجہ خیز، آگے بڑھنا، ترقی کرنا	مخلوط	: ملاجُلا، ملا ہوا
تدریس	: درس دینا، تعلیم دینا	مدنظر	: پیشِ نظر، ملحوظ
ترویج	: رواج دینا، اشاعت	مطبع	: کتاب شائع ہونے کی جگہ

ٹرانسلیشن	: ترجمہ	منعقد	: انعقاد ہونا
جریدہ	: اخبار،صحیفہ،میگزین،رسالہ	مؤرّخ	: تاریخ کا علم رکھنے والا
خاطر خواہ	: طبیعت کے موافق،حسبِ مرضی	مواد	: نثر یا نظم میں بیان کیا مضمون،موضوع
دوررَس	: دور تک پہنچنے والا	ناپید	: برباد، مٹنے والا
روایتی	: ریگولر	ناگزیر	: ضروری
ریاضی	: ہندسوں کا علم	نظرانداز کرنا	: بے اعتنائی برتنا،دھیان نہ دینا
سرپرستی	: نگہ بانی،دیکھ بھال	نظرِ ثانی	: دوبارہ غوروفکر
شرمندۂ تعبیر	: کسی شے یا کام کا پورا ہو جانا	نوزائیدہ	: جو ابھی پیدا ہوا ہو، جسے وجود میں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا
شغف	: لگاؤ		
عرض داشت	: درخواست،عرضی	نوعیت	: صورت حال،کیفیت،حالت
فاصلاتی	: گھر بیٹھے تعلیم حاصل کرنے کا نظام	وضع کرنا	: ایجاد کرنا،اپنی طرف سے بنانا،گھڑنا

12.14 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ : جامعہ اردو علی گڑھ پر ایک نوٹ لکھیے۔

سوال نمبر ۲ : ادارۂ ادبیات اردو کے اہم کارناموں کا ذکر کیجیے۔

سوال نمبر ۳ : اردو زبان و ادب کے تعلق سے قومی کونسل کے کردار پر روشنی ڈالیے۔

ب: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ : شامل نصاب کسی ایک ادارے پر ایک مضمون لکھئے۔

سوال نمبر ۲ : جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے اغراض و مقاصد بیان کیجیے۔

سوال نمبر ۳ : دارالترجمہ عثمانیہ کے متعلق اپنی معلومات سپرد قرطاس کیجیے۔

12.15 حوالہ جاتی کتب

۱۔ انجمن ترقی اردو کی ادبی خدمات از شہاب الدین ثاقب

۲۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی ادبی خدمات از ڈاکٹر مجید بیدار

۳۔ دارالمصنّفین اعظم گڑھ کے خدمات از خورشید نعمانی

۴۔ علمی ادبی اور تعلیمی ادارے از ابوسلمان

12.16 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ مولوی عبدالحق کی تحریک پر۔

﴿۲﴾ ۱۸/اگست ۱۹۱۹ء کو عمل میں آیا۔

﴿۳﴾ ۱۹۰۳ء میں قائم ہوئی۔

﴿۴﴾ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ تھی۔

﴿۵﴾ ۱۹۱۷ء میں حیدرآباد دکن میں قائم ہوا۔

﴿۶﴾ انگریزی اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کرنا۔

﴿۷﴾ ۱۹۲۳ء میں عمل میں آیا۔

﴿۸﴾ ایک خود مختار یونیورسٹی کا درجہ عطا کیا۔

﴿۹﴾ ادیب فاضل اور ادیب کامل۔

﴿۱۰﴾ ڈاکٹر محی الدین قادری زور

﴿۱۱﴾ ۱۹۱۳ء میں بمقام اعظم گڑھ اتر پردیش

﴿۱۲﴾ مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن

﴿۱۳﴾ ترقی اردو بیورو کی نئی شکل ہے۔

﴿۱۴﴾ وزارت برائے فروغ انسانی وسائل حکومت ہند

﴿۱۵﴾ ۱۹۹۸ء میں عمل میں آیا۔

﴿۱۶﴾ اردو

✵

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

Teenpani Bypass Road, Behind Transport Nagar

Haldwani - 263 139, Nainital (Uttrakhand)

Phone: 05946-261122, 261123 Fax No.: 05946-264232

www.uou.ac.in email: info@uou.ac.in

Toll Free No: 1800 180 4025

https://www.youtube.com/@91.2fmhellohaldwani7

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی کا عوامی ریڈیو جس کے ذریعہ طلبا کے لئے مفید پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

https://www.youtube.com/@uoulive

BAUL (N)-320-1(004360)